قیمت : -/10 روپے
اردو دنیا

اردو پریس کلب، نئی دہلی کے زیر اہتمام سید عاصم علی سبزواری کی کتاب ''اس دور کے مسلمانوں میں علم اور دین کا ناقص تصور'' کے جلسۂ اجرا میں کتاب کی رونمائی کرتے ہوئے (دائیں سے) سید حامد، کمال فاروقی، پروفیسر اختر الواسع اور قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین چندر بھان خیال۔

نیچے کی تصویر میں (دائیں سے) عظیم اختر، سید عاصم علی سبزواری، پروفیسر طاہر محمود اور اردو پریس کلب کے چیئرمین عبدالرشید شاہین۔

اردو دنیا

قومی اردو کونسل کا ماہانہ رسالہ

جلد۔11، شمارہ۔10، اکتوبر 2009

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپئے، سالانہ -/100 روپئے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔کے۔پورم، نئی دہلی- 066 110
فون:26103938، 26103381
فیکس:26108159، 26179657
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066
فون:26169416، 26109746

شاخ:110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون:24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2

ہماری بات .... ادارہ 5

زبان اور تعلیم

- نئے تعلیمی نظام کی ضرورت .... کے۔این۔ پانکر 6
- مہاراشٹر میں اردو تعلیم .... محمد حسن 8
- مغربی بنگال میں اردو .... شاہد اختر 10
- اردو حروف تہجی کی تعداد .... اظہر راہی 14

ادب وصحافت

- ادبی صحافت اور ہمارے ادبی رویے .... ابوالکلام قاسمی 17
- تمل ناڈو کی اہل قلم خواتین .... کے۔وی۔نکولن 20
- آثارالصنادید— آثاریات پر ایک اہم دستاویز .... ضیاء الرحمن صدیقی 23
- قانون کے دروازے پر .... فرانز کافکا 26

کلاسیکی ادب

- غزلیات فائز .... فائز دہلوی 27
- قصہ جان عالم اور انجمن آرا کا .... رجب علی بیگ سرور 28

صحت اور ٹیکنالوجی

- زراعت میں جینیٹکس کی اہمیت .... اقبال محی الدین 36
- خود پروردہ قاتل .... شمیم احمد صدیقی 39

کیریئر

- ٹیکنیکل رائٹنگ کی ضرورت وافادیت .... محمد اعجاز 42

رفتگاں

- ظفر احمد نظامی .... وقار صدیقی 43
- ابوالمجاہد زاہد .... عبدالرحیم نشتر 45

ہماری مطبوعات سے

- راقم الحروف محمد علی ردولوی عفی عنہ .... چودھری محمد علی ردولوی 47
- کسی تہذیب کے معیار دیگر معیاروں پر فوقیت نہیں رکھتے .... شمس الرحمن فاروقی 51

اردو خبر نامہ .... ادارہ 54

تبصرہ وتعارف 72

- یاد و بود غالب .... عبدالرشید اعظمی ....
- تبصرات ماجدی .... مرتضیٰ علی اطہر ....
- اردو زبان کی تدریس .... عبدالسمیع ....
- صبح مشرق کی اذاں .... مخمور سعیدی ....
- سرمۂ اعتبار .... ابوالکلام قاسمی ....
- اردو کا پہلا صاحب دیوان عرب شاعر، ڈاکٹر زبیر فاروق .... ادارہ ....
- ترجمے کا فن اور ترسیل کے طریقے .... ادارہ ....
- معصوم بجوکا .... ادارہ ....

بچوں کا گوشہ

- روبوٹ .... محمد خلیل 78
- ملا نصرالدین کا جبہ .... نور پیکر 80

آپ کی بات

■ **پروفیسر اختر الواسع، A-110، خان عبدالغفار خان انکلیو (جامعہ انکلیو)، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025**

مجھے یقین ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے آپ کی متحرک اور فعال سربراہی میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے اور آپ نے اردو والوں کو جس جدیدکاری سے ہم آہنگ کیا اس تجدید تعلق سے ایک بار پھر قومی کونسل کامیابی کی نئی منزلوں کو سر کرے گی۔

■ **نامی انصاری، 99/295، نالہ روڈ، چمن گنج، کانپور-208001**

ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ کی دوبارہ تقرری بہ حیثیت ڈائرکٹر یقیناً قومی اردو کونسل کی صحت کے لیے نیک فال ہے اور امید ہے کہ اب اس کی آب و تاب میں مزید اضافہ ہوگا۔

میں دہلی میں نہیں رہتا لیکن اردو اداروں کی سرگرمیوں سے کسی حد تک باخبر ضرور رہتا ہوں اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ (سابق وائس چیئرمین) کی قیادت اور ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ کی فعال شخصیت نے قومی اردو کونسل کی تعمیری کارکردگیوں میں خاطر خواہ اضافہ کیا تھا۔

■ **ڈاکٹر شیخ صلاح الدین، اکرام کلینک، گولی مار، سانتا کروز (ایسٹ) ممبئی-55**

ماہ جولائی کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ سرورق پر محترم کپل سبل کا مسکراتا چہرہ دیکھ کر اور ''ہماری بات'' میں آپ کی تحریر دیکھ کر کچھ امیدیں بندھی ہیں کہ آپ حضرات ملک کے بدلتے تعلیمی نظام اور پس منظر کو سمجھ رہے ہیں۔ شمارے کے اکثر مشمولات قابل مطالعہ ہیں مبیش بھٹ کی تحریر ''اردو اور میں'' پڑھ کر متاثر ہوا مبیش بھٹ کو میں قریب سے جانتا ہوں ان کی سماجی و سیاسی خدمات سب پر عیاں ہیں۔ حق گوئی اور بے باکی ان کے ضمیر میں شامل ہے۔

حیات افتخار کا مضمون ''علامہ اقبال اور سبرامنیم سوامی'' پڑھ کر تشنگی محسوس ہوئی یہ تحریر اگر شمارے میں شامل نہ بھی ہوتی تو شمارے کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ ظہیر غازی پوری کا مضمون ''قصیدہ ایک فراموش شدہ صنف سخن'' بھی پڑھا۔ موصوف کو پتہ ہونا چاہیے کہ قصیدہ کل کی ضرورت تھی عصر حاضر کی نہیں۔ اس صنف کی افادیت اب نہیں رہی۔ اس لیے قصیدے پر مرثیہ پڑھ دینا بہتر ہے۔ عارف عثمانی کا مضمون مرحوم حبیب تنویر بہت پسند آیا۔ تنویر حبیب کی خدمات کو ہم فراموش نہیں کر سکتے آخر میں بچوں کا گوشہ میں شجاع الدین شاہد کی کہانی ''خدمت خلق ہی عبادت ہے'' بڑی سبق آموز ہے موصوف کی اس کہانی میں بچوں اور بڑوں دونوں کی زبان میں بات کہی گئی ہے۔ اس طرح کے مضامین ''اردو دنیا'' میں شامل کرتے رہا کریں تاکہ صحت مند روایات کی شمع جلتی رہے۔

■ **احسان اللہ دانش، روڈ نمبر-6، کریم گنج، گیا-823001**

اردو دنیا کا شمارۂ اگست 2009 موصول ہوا۔ اس شمارے کے سرورق کو دیکھ کر مسرت ہوئی، قومی اردو کونسل کی مطبوعات کی موبائل وین جو ''اردو کتابوں کی موبائل نمائش'' پر مبنی ہے واقعی اردو کے فروغ کے لیے ایک مستحسن قدم ہے۔ اس کے لیے وزیر موصوف کپل سبل اور ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ لائق صد تحسین ہیں۔ میں نے اس سے قبل بھی ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ کے دور اول میں موبائل وین کی نمائش علاقہ مگدھ کے گیا شہر میں جو عالمی شہرت کا حامل ہے مختلف موضوعات پر کتابیں دیکھی تھیں اور ضرورت کے مطابق خریدی بھی تھیں۔ لہٰذا میری آپ سے گزارش ہے کہ اس بار بھی موبائل وین کا رخ شہر گیا کی طرف ضرور کرائیں تاکہ علم و ادب کا گہوارہ کہا جانے والا علاقہ مگدھ بالخصوص گیا کے اہل علم، اہل ادب، باذوق قارئین اور طلبہ و طالبات کو اس نایاب خزانے سے استفادے کا موقع مل سکے۔

■ **محبوب حسن، ماہی ہاسٹل-33، جے این یو، نئی دہلی-67**

رسالہ وقت سے موصول ہوا۔ دلی شکریہ! اس سے ادارے کی سرگرم کارکردگی ظاہر ہوتی ہے۔ گلوبلائزیشن کے اس دور میں عالمی سطح پر سماجی، سیاسی، اقتصادی، ادبی اور تہذیبی اعتبار سے ہونے والی تبدیلیوں نے بڑی حد تک انسانی زندگی اور معاشرے کو متاثر کیا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ان تمام نشیب و فراز کی بازگشت اس رسالے میں صاف طور پر سنائی پڑتی ہے۔ یعنی آنکھ سے آنکھ ملا کر چلنے والی کہاوت اس پر صادق آتی ہے۔ محترم خالد محمود صاحب نے اردو والوں کی ذمے داری کو بحسن و خوبی واضح کیا ہے۔ مضمون پڑھنے کے بعد مجھے اپنی ذمے داری کا احساس شدید طور پر ہوا۔ امید کہ دوسرے لوگوں کو بھی ہوا ہوگا۔ انھوں نے نہایت اختصار کے ساتھ چند اہم مسائل پر روشنی ڈالنے کی بھرپور کوشش ہے۔ امید ہے کہ وہ آگے اس نوعیت کی گفتگو جاری رکھیں گے۔

جناب احسان حسن صاحب نے نہایت اہم موضوع پر مضمون سپرد قلم کیا ہے۔ شکریہ! ایسا لگتا ہے کہ وہ تحقیق کے گرتے معیار کو لے کر فکرمند ہیں۔ انھوں نے ریسرچ کے گرتے ہوئے معیار و وقار کے ممکنہ چند وجوہات کو اجاگر کرتے ہوئے مدلل و سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ انھوں نے ان قصورواروں اور ذمے داروں کو ہدف تنقید بھی بنایا ہے۔ جو کہ مناسب ہے۔ میرا بھی موقف یہی ہے کہ اس نصابی تحقیق کے معیار میں گراوٹ کے لیے نہ صرف طلبہ بلکہ بڑی حد تک نگراں حضرات بھی ذمے دار اور قصوروار ہیں۔ وہ اپنی اس ذمے داری سے سبک دوش نہیں ہو سکتے۔ دراصل آج کے اس مادی دور میں تحقیق کا مفہوم ہی بدل گیا ہے۔

ہماری ادبی تحقیق میں بڑے پیمانے پر خلفشار اور انتشار کا عالم پایا جاتا ہے۔ کوئی اسے رُتبے اور شان کی چیز تو کوئی دولت کمانے کی مشین سمجھتا ہے۔ مگر ان حضرات کے غیر ذمے دارانہ رویے جہاں ایک طرف اردو ادب کا ناقابلِ تلافی نقصان کر رہے ہیں وہاں دوسری طرف طلبہ کی فکر بالیدگی بھی متاثر ہوتی ہے اس کے لیے ہم سب کو بیدار ہونے کی ضرورت ہے۔ محمد اختر صاحب نے فضا ابن فیضی کے فکر و فن کو خوبصورتی کے ساتھ سمیٹنے کی سعی کی ہے۔ جناب مہتاب عالم نے فراق گورکھپوری کی شعری اہمیت و افادیت کو از سرِ نو پیش کیا ہے۔ رسالے کے دوسرے مضامین بھی اہم اور قابلِ ذکر ہیں۔ نذیر احمد یوسفی کا افسانہ ''چھوٹی سی بھول'' پڑھتے ہی دادی کی یاد آنے لگی۔

■ **شاہ عمران حسن، پوسٹ بکس نمبر 9729، جامعہ نگر، نئی دہلی-25**

''اردو دنیا'' کا ہر شمارہ نئے رنگ ڈھنگ کے ساتھ مل رہا ہے۔ اگست 2009 کا شمارہ بھی ہمیں وقت پر ملا۔ اس دفعہ آپ نے کلاسیکی ادب کا سلسلہ شروع کر کے ہم اردو ادب والوں کو شکریے کا ایک اور موقع فراہم کیا ہے۔ ''آپ کی بات'' اور ''ہماری بات'' کا جوڑ نرالا ہے۔ جہاں آپ قارئین کو دل کھول کر اپنی بات کہنے کا موقع دیتے ہیں وہیں آپ اپنی بات بھی بنا لاگ لپیٹ کے کہہ جاتے ہیں۔

عملی زندگی میں اب تو اردو محدود ہوتی جا رہی ہے۔ ہاں اکابر و اصاغر دونوں اردو پر نعرے بازی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن اردو کی ترقی صرف نعرے بازی سے ممکن نہیں۔ ہمیں عملی اقدام کرنا ہوگا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اور آپ کے ادارے کی جانب سے اردو سکھانے کی مہم جاری ہے یہ اردو کے لیے بہت خوش آئند بات ہے۔ اگر ہر اردو جاننے والا ایک اردو نہ جاننے والے کو اردو پڑھنا سکھا دے تو کتنا اچھا ہو۔ Each one teach one کے اصول پر یہ کام کیا جا سکتا ہے۔

■ **ڈاکٹر ناظم علی، صدر شعبۂ اردو گری راج گورنمنٹ کالج، نظام آباد**

اگست کے شمارے میں اداریے کے تحت جو باتیں بیان کی گئیں وہ صد فیصد حقائق پر مبنی ہیں۔ تحریری ادب پر الکٹرانک میڈیا سبقت لے جا رہا ہے۔ لیکن محض بصارت سے جو چیز ہاتھ آتی ہے وہ دیرپا نہیں ہوتی بصیرت تحریری الفاظ کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے۔ سماج میں لکھنے پڑھنے کا رواج کم ہو گیا ہے۔ کتاب زندگی کی سچی ساتھی ہے لیکن عوام سے کتابی کلچر دور ہو گیا ہے۔ کتب خانوں میں عمدہ اور اعلیٰ درجے کی کتابیں موجود لیکن اٹھا کر پڑھنے والے مفقود۔ قومی اردو کونسل نے موبائل وین شروع کی ہے اس سے عوام میں اردو کتب پڑھنے کا ذوق و شوق بڑھے گا۔ اس موبائل وین کو ملک کے ہر صوبے میں جانا چاہیے۔ عبدالغنی شیخ نے تعلیمی نظامِ تعلیم میں اصلاح کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ نظامِ تعلیم میں جو نقائص موجود ہیں ان کو دور کرنا اساتذہ کے ساتھ انتظامیہ کی ذمے داری بھی ہے۔ ڈاکٹر چمن آرا خان نے زبان سکھانے کے اہم اصولوں کو موثر انداز سے پیش کیا ہے۔ مرتضیٰ علی اطہر نے اعلیٰ تعلیمی نظام میں وقت کے تقاضوں کے تحت تبدیلی پر زور دیا ہے۔

ابوالکلام قاسمی نے منیب الرحمٰن اور جگر و فراق کی نظمیں میں منیب الرحمٰن کی نظم نگاری کی خصوصیتوں کو اجاگر کرتے ہوئے ان کی نظم ''بازدید'' کا اچھا محاکمہ کیا ہے۔ ابرار رحمانی نے غیر افسانوی تحریروں کی روشنی میں تحریکِ آزادی اور پریم چند میں نیا مواد پیش کیا ہے۔ سرورالہدیٰ نے نثار احمد فاروقی جیسے اعلیٰ پایے کے نقاد و محقق کی سیرت، شخصیت اور حالاتِ زندگی کو اجاگر کیا ہے۔ شکیل اختر نے اردو اخبارات کے لسانی و تہذیبی سروکار پر عمدہ مضمون لکھا ہے انھوں نے جام جہاں نما سے البلال والبلاغ تک تمام اخبارات و جرائد کے کردار کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ دور کی صحافت اپنے جلو میں عصری تمدن، ثقافت و تہذیب کو سموئے ہوئے ہوتی ہے۔ لیکن آج صحافت سیاست کے تابع ہو گئی ہے۔ شمیم احمد صدیقی نے سوائن فلو کے متعلق اچھی معلومات فراہم کی ہیں اس پر قابو پانے کے لیے دوائیں اور نسخے بتاتے تو سونے پہ سہاگہ تھا۔ خان قمر الزماں نے ای بکس یعنی الیکٹرانک کتابوں کا جامع و مفصل احاطہ کیا ہے۔ زبیر رضوی سے گفتگو معلوماتی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے خواجہ میر درد کی عشقیہ شاعری کا بہت خوب تجزیہ کیا ہے ویسے بھی خواجہ میر درد پر کم لوگوں نے لکھا ہے۔

■ **ڈاکٹر کے. وی. نکولن، شعبۂ اردو، شری سنکرہ آچاریہ یونیورسٹی (علاقائی مرکز) کوئی لنڈی-673330 (کیرالہ)**

میں ریاست کیرالہ کی سنسکرت یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں سینئر لکچرار ہوں۔ میری مادری زبان ملیالم ہے اور میں غیر مسلم ہوں۔ گذشتہ دس سال سے سنسکرت یونیورسٹی میں ایم. اے (اردو) او رایم فل (اردو) کی درس و تدریس پر مامور ہوں۔ اردو کونسل کا ترجمان ''اردو دنیا'' پابندی سے پڑھتا ہوں۔ یہ میرا پسندیدہ رسالہ ہے اس لیے بھی کہ اس میں جو تحقیقی مضامین شائع ہوتے ہیں وہ مواد و معیار دونوں کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہوتے ہیں۔

کیرالہ ایک دور افتادہ ریاست ضرور ہے لیکن یہاں اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے ماحول سازگار ہے۔ لڑکوں کی بہ نسبت لڑکیوں میں اردو سیکھنے کا ذوق زیادہ ہے۔ تقریباً تین ہزار سے بھی زیادہ اردو اساتذہ ریاست کیرالہ میں درس و تدریس کی خدمات پر مامور ہیں۔ اگر اردو کونسل کی طرف سے بمقام کالی کٹ ایک اردو میلے کا اہتمام ہو جائے تو کیرالہ کے اردو داں اور طلبہ و طالبات کے حق میں مفید ثابت ہوگا۔ کیرل میں اردو کی سازگار فضا کو قائم رکھنے میں اردو کونسل کا تعاون بہت ضروری ہے۔ امید ہے کہ آپ کا تعاون ہمیں حاصل ہوگا۔

■ **کوثر صدیقی، ایڈیٹر ''کاروانِ ادب''، زیب ولا، A-79، کنٹوری، بھوپال**

حال ہی میں مختلف ریاستوں میں مدرسہ بورڈ قائم کیے گئے ہیں۔ دیگر امور سے قطع نظر مدرسہ بورڈ کے اغراض و مقاصد کو دیکھتے ہوئے اردو زبان و ادب کے فروغ کی امید ان سے وابستہ نہیں کی جا سکتی۔ ان حالات میں بہتر یہ ہوگا کہ اردو کی بنیادی تعلیم کا صوبائی سطح پر الگ بورڈ قائم کیا جائے۔ یہ ممکن نہ ہو تو دوسری تجویز

اردو اکادمیوں کے re-orientation کی ہوسکتی ہے۔ اس کے تحت مرکزی حکومت کی طرف سے ایک مرکزی اردو ادارہ قائم کیا جانا مناسب ہوگا۔ یہ ادارہ صوبائی ریاستوں کی ضروریات کے لحاظ سے اور ان کے صلاح مشورے سے صوبائی ٹارگیٹ طے کرکے صوبائی اردو اکادمیوں کو ان پر عمل کرنے کی ہدایت دے۔ یہ مرکزی (Apex) ادارہ صوبائی اکادمیوں کی کارکردگی کا وقت بوقت جائزہ لیتا رہے۔

مرکزی حکومت بھی یہ ادارہ قائم کرسکتی ہے او رملک کی صوبائی اردو اکادمیاں مل کر بھی اپنے لیے ایک Mother Organisation قائم کرسکتی ہیں۔ یہ مرکزی ادارہ ہر صوبے کا وہاں کی ضروریات کے مطابق تعلیمی جائزہ لے کر ہر صوبے کے اردو علاقوں/ پاکیٹ میں اردو کی بنیادی تعلیم کا ایک مستقل لائحہ عمل وضع کرنے کے ساتھ infra structure بھی تیار کرے صوبہ وار اہداف کا تعین کرکے ان کی حصول یابی کے لیے عہدہ داران کی ذمے داری بھی طے کرے۔

اردو کی بقا اور ارتقا اگر منظور ہے تو اہل اردو کو سنجیدہ ہونے کی سخت ضرورت ہے۔ اردو کی NGOs قائم کی جائیں جو صوبائی حکومتوں او رمرکزی حکومت سے رقوم کی فراہمی اور اردو کی بنیادی تعلیم کے مسائل پر باز پرس کرتی رہیں۔ بچوں کی بنیادی تعلیم اردو میڈیم کے ذریعے دیے جانے سے بچوں کے کیریئر (Career) پر منفی اثرات پڑ سکتے ہیں۔ یہ خیال یا وسوسہ دل سے نکال دیا جائے۔ کیونکہ یہ محض ایک واہمہ ہے۔ ہمیں اپنی مادری زبان سے بے رغبتی ترک کرکے کچھ انقلابی قدم اٹھانا ہوں گے۔

■ **اشفاق لعل خان، ملت اسکول، 141، ایس وی روڈ جوگیشوری (ویسٹ)، ممبئی-102**

دیگر ریاستوں کے مقابلے میں مہاراشٹر میں ''اردو زبان کی تعلیم'' اور'' اردو زبان میں تعلیم'' کے لیے تعلیم گاہوں اور اداروں کی اطمینان بخش تعداد موجود ہے۔ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا اس لیے ضروری ہے کہ مادری زبان میں دی جانے والی تعلیم نہ صرف طالب علم کے اکتساب علم کو آسان اور سریع الفہم بناتی ہے بلکہ اس کی شخصیت کی صحیح خطوط پر نشو ونما بھی کرتی ہے۔

مادری زبان کا ماحول اس کے اندر موجود صلاحیتوں او راس کی شخصیت کی ہمہ جہت نشو ونما کے لیے نہایت مددگار ثابت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر دسویں اور بارھویں کے امتحان میں اول آنے والا طالب علم ورنیا کیولر (Vernacular) میڈیم کا ہی ہوتا ہے۔

موجودہ زمانے میں انگریزی زبان دنیا کی تمام زبانوں پر غلبہ حاصل کرنے کے درپے ہے اور زبانیں کسی قوم اور خطے کی جاگیر نہیں ہوتیں بلکہ یہ بنی نوع انسان کو خدا کی طرف سے عطا کردہ نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ انگریزی سیکھنے کے لیے انگریزی میڈیم اسکول میں تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے، یہ خام خیالی کے سوا کچھ نہیں۔ اردو میڈیم سے تعلیم یافتہ افراد ایسے بھی ہیں جو نہ صرف عمدہ انگریزی بول سکتے ہیں بلکہ انگریزی زبان میں لکھتے بھی ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے اسکولوں میں انگریزی زبان کی تدریس پر وہ توجہ نہیں دی جاتی جس کا موجودہ حالات ہم سے تقاضا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا مرفہ الحال طبقہ اپنے بچوں کو انگریزی میڈیم اسکولوں میں داخل کروا رہا ہے۔

غور طلب ہے کہ انگریزی میڈیم سے پرائمری جماعتوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو دوہری محنت کرنی پڑتی ہے۔ پہلے تو انھیں مواد کا اپنی مادری زبان میں ترجمہ کرنا ہوتا ہے پھر اس مواد کے مفہوم اور concept کو سمجھنا ہوتا ہے۔ جبکہ مادری زبان سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ براہ راست مواد کے مفہوم اور concept کو سمجھ لیتے ہیں۔ اس طرح ان کی بنیادیں مضبوط ہوجاتی ہیں جو آنے والے تعلیمی سالوں میں معین ومددگار ثابت ہوتی ہیں۔

انگریزی میڈیم میں زیر تعلیم طلبہ ہماری تہذیب وثقافت سے نامانوس اور نابلد رہ جاتے ہیں اور مغرب زدگی کا تاریک سایہ ان کی معصوم زندگیوں پر پڑتا ہے۔ جس کے نتیجے میں صالح اعمال ان کی نظروں میں بے وقعت اور بے قیمت ہوجاتے ہیں۔ مذہب کا پاکیزہ طرز زندگی ان کے لیے مذاق کا موضوع بن جاتا ہے۔ تسلیمہ نسرین اور سلمان رشدی اسی تعلیمی نظام کی پیداوار ہیں۔

اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے نونہالوں کو انگریزی میڈیم کے بجائے اردو میڈیم میں داخل کرائیں اور ساتھ ہی ساتھ ابتدائی جماعتوں سے ہی انھیں انگریزی الفاظ سننے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کریں۔ بازار میں دستیاب انگریزی سیکھنے میں معاون کتابیں، کیسیٹس اور سی ڈیز وغیرہ کا استعمال کریں۔ اگر ہم انگریزی جانتے ہیں تو خود ان کے ٹیوٹر اور استاد بن جائیں جو بچوں کے ساتھ Teaching is Learning twice کے مصداق ہمارے لیے بھی مفید ہوگا۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو اچھے انگریزی داں استاد کی مدد لی جاسکتی ہے اور وہ موٹی رقم جو عطیے کے نام پر ہم کونونٹ اسکولوں کو ادا کرتے ہیں ان ماہر اور قابل اساتذہ کو دیں تو آسانی سے ہمارے بچے انگریزی زبان میں مہارت حاصل کرسکتے ہیں اور مغربیت کی بادصرصر سے بھی محفوظ رہ سکتے ہیں۔

■ **زبیر احمد فاروقی، مدیر اعلیٰ، روزنامہ انوار قوم، کانپور**

اردو دنیا کا تازہ شمارہ آج ہی موصول ہوا۔ باوجود اخباری مصروفیات کے مشمولات پر نگاہ ڈالی۔

''اردو خبرنامہ'' کے تحت اردو اخبارات کے تراشے بھی نظر نواز ہوئے۔ جس سے قومی سطح پر ہونے والی سرگرمیوں کے بارے میں اردو کے تعلق سے ہی معلومات کثیر ہوئی۔ ان تراشوں میں فطری طور پر میری نگاہ ''انوار قوم'' کے کسی تراشے پر ہوتی ہے لیکن ہر ماہ مایوسی ہی ہاتھ لگتی ہے۔ اگر ''انوار قوم'' کے تراشے بھی ''اردو خبرنامہ'' میں شامل ہوتے تو بلاشبہ ہماری حوصلہ افزائی ہوتی۔ اردو کے فروغ کے لیے آپ کی سعی مسلسل ضرور رنگ لائے گی۔ (انشاء اللہ)

□□□

ہماری بات

ملک اور معاشرے میں تیزی سے جگہ بناتی بدعنوانی پر وزیراعظم جناب من موہن سنگھ کی فکرمندی بروقت بھی ہے اور قابل تحسین بھی۔ انھوں نے انتظامیہ کی مختلف سطحوں، خاص طور پر اعلیٰ سطح پر ہونے والی بدعنوانی کے خلاف جارحانہ پہل کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے تفتیشی ایجنسیوں کو ہدایت دی ہے کہ وہ اس معاملے میں موثر کارروائی کریں۔ انھوں نے نئی دہلی میں سی بی آئی اور ریاستی تفتیشی ایجنسیوں کی دوروزہ کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے 26 اگست کو اپنی اس فکرمندی اور تشویش کا اظہار کیا۔

ملک اور معاشرے میں روزمرہ بڑھتی ہوئی بدعنوانیاں واقعی تشویشناک ہوتی جارہی ہیں، کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اس موذی مرض میں مبتلا نہ ہو۔ ملک کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے جو فلاحی اسکیمیں تیار کی جاتی ہیں انھیں جب روبہ عمل لایا جاتا ہے تو وہ بدعنوانیوں کی نذر ہوجاتی ہیں، نتیجتاً اصل حقداروں کو ان کا حق نہیں ملتا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کسی بھی سماج کی ریڑھ کی ہڈی اس کی معیشت ہے۔ اگر معیشت کو ہی گھن لگ جائے گا تو سماجی بہبود کے امکانات کم سے کم ہوجائیں گے۔ بدعنوانیوں پر لگام کسنے والی سرکاری ایجنسیوں کے ذمے داروں کو مخاطب کرتے ہوئے وزیراعظم نے واضح الفاظ میں کہا کہ یہ ایجنسیاں صرف چھوٹے موٹے معاملات کی جانچ پڑتال تک ہی خود کو محدود نہ رکھیں بلکہ ان لوگوں پر بھی شکنجہ کسیں جو اونچے اونچے عہدوں پر فائز ہیں اور اپنی اس حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ وزیراعظم نے کہا کہ بدعنوانی کے سمندر کی ان بڑی مچھلیوں کو پکڑنے کے لیے ایسا جال بچھایا جانا چاہیے جسے توڑ کر وہ باہر نہ نکل سکیں۔ بدعنوانی مختلف سطحوں پر پنپ رہی ہے اس لیے اس کے خلاف ہر سطح پر لڑنا ہوگا۔

عام لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال راسخ ہوتا جارہا ہے کہ بدعنوانی میں ملوث نسبتاً غیراہم افراد تو گرفت میں آجاتے ہیں لیکن اصل مجرم بالعموم بچ نکلتے ہیں۔ وزیراعظم نے کہا کہ لوگوں کے ذہنوں میں جگہ بناتے ہوئے اس خیال کو بدلنا بہت ضروری ہے اور اس کے لیے تفتیشی ایجنسیوں کو اپنے کام کے طریقوں میں اصلاح کرنی ہوگی۔ گذشتہ کچھ دنوں میں بدعنوانی کے بڑھتے ہوئے معاملات جس طرح منظرعام پر آئے ہیں اس سے حکومت اور حکومتی ایجنسیوں کے تئیں عوام کا اعتماد مجروح ہوا ہے جسے بحال نہ کیا گیا تو عوام بددلی کا شکار ہوجائیں گے اور دنیا کی اس سب سے بڑی جمہوریت کی بنیادیں متزلزل ہوجائیں گی۔ اگر ایسا ہوا تو یہ ملک وقوم کے حق میں ایک بہت براشگون ہوگا۔ وزیراعظم نے یہ بھی کہا کہ بڑھتی ہوئی بدعنوانیوں کا خمیازہ سب سے زیادہ غریب طبقے کو اٹھانا پڑتا ہے کیونکہ سرکار کی جانب سے ان کی بہبود کے لیے کیے جانے والے اقدامات بڑی حد تک بے اثر ہوکر رہ جاتے ہیں۔ بدعنوانی سے بیرونی دنیا میں بھی ملک کی امیج خراب ہورہی ہے اور اس سے بیرونی سرمایہ کار اکثر تذبذب میں پڑجاتے ہیں۔

وزیراعظم نے مزید کہا کہ اس ساری صورت حال کا ایک اور پہلو بھی اصلاح طلب ہے۔ انتظامی اور مالی بے ضابطگیوں کے جو معاملات سامنے آتے ہیں، عدالتوں میں ان کے تصفیے اکثر بہت تاخیر سے ہوتے ہیں اور ملزم اس تاخیر کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس نوعیت کے کسی بھی مقدمے کا فیصلہ جلد سے جلد ہونا چاہیے۔ تاکہ مجرموں کو بروقت سزا دی جاسکے۔

وزیراعظم کے اس خیال کی تائید سی بی آئی کے ڈائرکٹر اشونی کمار کے بیان سے بھی ہوتی ہے جن کا کہنا ہے کہ بدعنوان افسران کے معاملات کی جانچ پڑتال عدالتوں میں جس سست روی سے ہوتی رہی ہے، اس سے بدعنوان لوگوں کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں اور انھیں اتنا وقت مل جاتا ہے کہ وہ اپنے بچاؤ کی مختلف تدبیریں اختیار کرسکیں جن میں ایک تدبیر ثبوتوں کو کمزور کردینا بھی ہے۔

ہندوستان میں کرپشن کی بڑھتی ہوئی وبا پر کس طرح قابو پایا جائے، اس سوال کا جواب چنداں آسان نہیں۔ اس مسئلے پر تبادلۂ خیال کے لیے مرکزی اور ریاستی تفتیشی ایجنسیوں کی طرف سے دوروزہ کانفرنس کا انعقاد اور اس کانفرنس سے وزیراعظم کا خطاب اس مسئلے کی شدت کو سامنے لاتا ہے۔ دوسری مناسب تدبیروں کے علاوہ ایک تدبیر یہ بھی قابل عمل ہے کہ کرپشن کے خلاف عوامی ردعمل شدید بھی ہو اور ہمہ گیر بھی۔ یہ کام مشکل نہیں اگر ملک وقوم کی بہتری کے لیے ہر شخص اپنی ذمے داری سمجھے اور اسے پورا بھی کرے۔ اس طرح اجتماعی اور انفرادی دونوں سطحوں پر اصلاح احوال کی جو کوششیں ہوں گی، ان کا بارآور ہونا یقینی ہوگا۔

□□□

کے. این. پانکر

نئے تعلیمی نظام کی ضرورت

ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم پر حالیہ بحث وتمحیص ایسے وقت ہو رہی ہے جب موجودہ تعلیمی نظام کی جدیدکاری کے لیے اندرونی نیز بیرونی دباؤ بڑھ رہا ہے۔ عام خیال ہے کہ موجودہ تعلیمی نظام ہماری ضرورتوں کے مطابق نہیں ہے۔ یہ بے لچک، جامد اور غیر منظم ہے۔ نیز ہماری سماجی ضرورتوں کے تئیں بے حس بھی۔ یونیورسٹیوں کو مزید فعال بنانے اور ان کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے پروفیسر یشپال کی سرکردگی میں یونیورسٹی گرانٹ کمیشن (UGC) کی تشکیل کردہ کمیٹی کا ماننا ہے کہ ''ہمارے گردوپیش کی دنیا ڈرامائی انداز میں بدل چکی ہے۔ لیکن ہماری اعلیٰ تعلیم اب بھی پرانے لائحۂ عمل پر ہی برسرکار ہے اس شعبے میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے جو کبھی کبھی کے معمولی حذف و اضافہ سے ممکن نہیں ہے۔''

نظام تعلیم میں بنیادی تبدیلی بہت پہلے آزادی کے فوراً بعد ہو جانا چاہیے تھی۔ ڈی ایس کوٹھاری اور ایس رادھا کرشنن رپورٹوں میں اس تبدیلی کے لیے لائحۂ عمل بھی وضع کر دیے گئے تھے۔ لیکن ان رپورٹوں کی روشنی میں جو کچھ ہوا وہ نہ ہونے کے برابر ہی تھا اور نوآبادیاتی دور کا نظام آج بھی جاری ہے۔ ظاہر ہے یہ باز نوآبادیاتی سماج کی ضرورتوں کے مطابق نہیں ہے۔ کیونکہ نوآبادیاتی نظام تعلیم کی غایت مقامی باشندوں کو تعلیم یافتہ بنانے سے زیادہ ان کی صلاحیتوں کو نوآبادیاتی ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرنا تھا۔ نوآبادیاتی نظام کے اتباع میں آج بھی اعلیٰ تعلیم عوام کی رسائی سے پرے ہے غریبوں، خاص کر دلتوں، آدی باسیوں اور خواتین کو تعلیمی مواقع سے مستفید ہونے کے خاطرخواہ مواقع نہیں ملے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اعلیٰ تعلیم اب تک جمہوری کردار حاصل نہیں کر سکی ہے اور ریاست اس کے لیے ضروری سہولتیں فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ جمہوری کردار کے استحکام کے لیے مناسب تعداد میں اداروں کا قیام خاص کر دیہی علاقوں میں، آج کی بنیادی ضرورت ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے معیار میں زوال تمام ماہرین تعلیم کے لیے باعث تشویش ہے۔ تمام ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ اعلیٰ تعلیم کے معیار میں زوال ہر سطح پر ہے۔ یہ واضح حقیقت ہے کہ پچھلی کئی دہائیوں سے غیر مبدل نصاب تعلیم وقت سے مطابقت نہیں رکھتا ہے، معلومات کی وسیع ہوتی سرحدوں سے مطابقت تو دور کی بات ہے۔ چند خاص مراکز کے علاوہ نجی، سرکاری اور سیلف فائنانس اداروں میں دی جانے والی تعلیم کا معیار کافی ناقص ہے۔ اپنے بنیادی ڈھانچے اور دانشورانہ وسائل کے حوالے سے وہ اعلیٰ تعلیمی ادارے کہے جانے کے مستحق نہیں ہیں۔

نئی ضرورتوں کے مدِنظر اب تمام صوبوں میں مرکزی یونیورسٹیاں قائم کی جارہی ہیں اور چند ''عالمی معیار'' کی یونیورسٹیوں کا قیام بھی زیر غور ہے۔ موجودہ حالات اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ تعلیمی معیار میں بہتری کا زیادہ تر انحصار انڈر گریجویٹ نظام پر ہے، جو فی الحال تعلیمی نظام کا سب سے کمزور حصہ ہے کیونکہ اس پر سب سے کم توجہ صرف کی گئی ہے۔ فی الحال تمام بحث ابتدائی اقدام، سرمایہ کاری اور پیشہ ورانہ تعلیم پر مرکوز ہے یہاں تک کہ اعلیٰ تعلیم کو بھی پیشہ ورانہ تعلیم کے ساتھ مربوط کیا جارہا ہے۔ سماجی و آفاقی علوم اور نظری سائنس (Pure Science) کی تعلیم کو جس میں سب سے زیادہ یعنی تقریباً 80 فیصد طلبہ داخلہ لیتے ہیں، مناسب اہمیت نہیں دی جارہی ہے۔ نتیجتاً مناسب تعداد میں قابل اساتذہ، بنیادی ضروری ڈھانچے اور حسب ضرورت دانشورانہ وسائل کے بغیر انڈر گریجویٹ تعلیم کی صورت حال افسوسناک ہے۔ کچھ ریاستوں میں کالج صرف حکومتی بہی کھاتوں میں ہیں۔

اکثر و بیشتر تعلیمی معیار کی بحث صرف نصاب تعلیم تک محدود رہتی ہے۔ اس پر بحث نہیں ہوتی کہ کسی بھی تعلیمی نظام پر وقفے وقفے سے نظرثانی کرنا اور اسے بہتر بنانا چاہیے۔ اگرچہ یہ بھی ضروری نہیں کہ نصاب پر نظرثانی تعلیمی اعتبار سے بہرحال سودمند ہوگی۔ تعلیمی معیار کی بہتری میں نصاب کی دین کا انحصار اس پر ہے کہ کلاس روم میں اسے کس طرح استعمال کیا جارہا ہے۔

اعلیٰ تعلیم کی خامیاں صرف اس کے معیار تک محدود نہیں ہیں بلکہ ان میں تنظیمی خامیاں بھی برابر کی شریک ہیں۔ اگر اعلیٰ تعلیم کو بہتر بنانا ہے تو کالجوں اور یونیورسٹیوں کے مابین موجودہ رشتوں کو مکمل طور سے تبدیل کرنا ہوگا۔

ابتداً جب یو جی سی نے تعلیمی نظام میں اصلاح کے لیے خودمختاری کا مشورہ دیا تھا تو اس سے منتظمین کو غیرضروری اختیارات حاصل ہو جانے کا عام خدشہ ظاہر کیا گیا تھا۔ ملک میں تقریباً 300 خودمختار کالج ہیں جن کے طریقۂ عمل کو دیکھتے ہوئے یہ خدشہ حق بجانب تھا۔ تاہم کالجوں کی خودمختاری کے بغیر یونیورسٹیوں کا اپنی بنیادی ذمے داریوں پر توجہ مرکوز رکھنا ممکن نہیں ہوگا نہ ہی خودمختاری کے بغیر کالجوں میں تعلیمی پیش رفت ممکن ہوگی۔

پالیسی وضع کرنے والے اور انتظامیہ اس مسئلے سے بخوبی واقف ہیں لیکن

ان کے پیش کردہ حل اصل مسئلے سے میل نہیں کھاتے۔ مثلاً نیشنل کانج کمیشن اور یو.جی.سی (NKC&UGC) کا خودمختاری میں جوابدہی کی آمیزش کا مشورہ اہم تو ہے لیکن اس کا مناسب اور موزوں ہونا غور طلب ہے۔ خودمختاری صرف جمہوری عمل کے ذریعے بامعنی ہوسکتی ہے۔ اگر خودمختار کالج توقعات کی تکمیل نہیں کرسکے تو اس کی وجہ جمہوری ماحول میں ان کا کام کاج نہ کرنا ہے۔

تعلیمی معیار میں بہتری لانے کے لیے ضروری ہے کہ نظام تعلیم، تنظیمی ڈھانچے، دانشورانہ وسائل، اساتذہ کے معیار اور تدریسی مشقوں کی مکمل ومبسوط جدیدکاری ہو۔ اس کے لیے وافر سرمایہ درکار ہوگا۔ گیارھویں پنج سالہ منصوبے میں اعلیٰ تعلیم کے لیے خطیر رقم مختص کی گئی ہے جو دسویں پنج سالہ منصوبے کے مقابلے میں نوگنا زیادہ ہے۔ تاہم حکومت یہ بھی تسلیم کرتی ہے کہ عوامی سرمایہ کاری میں اسقدر کثیر اضافہ بھی عام شرح داخلہ (General Enrollment Ratio) کو 15 فیصد تک پہنچانے کے ہدف کے حصول کے لیے ناکافی ہوگا۔ ایک تخمینے کے مطابق وسائل کی یہ کمی 2.52 لاکھ کروڑ روپئے سے زیادہ ہے۔ حکومت نے اس خلا کو پر کرنے کے لیے ملک و بیرون ملک کے روشن خیال اور منی براقدار تعلیمی مہم جوئی کے علم برداروں کو شراکت کا مشورہ دیا ہے۔

ہندوستان میں خیرخواہانہ مقاصد سے متاثر ہوکر تعلیم میں نجی شراکت کی تاریخ کافی قدیم ہے۔ لیکن ماضی کے برعکس اب منافع کے لیے نجی تعلیمی مہم سرمایہ کاری کا میدان ہے۔ نجی یونیورسٹیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور موجودہ سرحد پار ادارے جو تعلیم کی جدیدکاری میں دلچسپی لے رہے ہیں، سرمایہ دارانہ مفادات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ شاید یہ بات سچ ہے کہ نجی سرمائے کے بغیر جدیدکاری کی مانگ کو پورا نہیں کیا جاسکتا الا یہ کہ حکومت اعلیٰ تعلیم کو مزید ترجیح دے۔ اگر سرکاری ونجی شراکت کو بطور حل اپنایا بھی جائے جیسا کہ حکومت کی پالیسی سے ظاہر ہوتا ہے، تو تعلیم کو بے روک ٹوک اور بے لگام تجارتی بنانے سے روکنے کے لیے اس کی تحدید ضروری ہے۔ تعلیم جس تیزی کے ساتھ نجی کاری کی طرف جارہی ہے، ممکن ہے سماجی انصاف سب سے پہلے اس کی زد میں آئے۔ طبقاتی سماج میں تعلیم قوت واختیارات حاصل کرنے کا ذریعہ ہے خاص کر موجودہ صورت حال میں جس میں معلومات غیرمساوی رشتوں کے اہم عنصر کی حیثیت اختیار کرگئی ہے۔ نجی تعلیمی نظام کا پورا نظریاتی خاکہ حاشیے پر کھڑے لوگوں کے مستقل اخراج اور علیحدگی میں معاون ہے۔

اگر دستور میں مذکور مبنی برمساوات سماج قائم کرنا ہے تو حکومت کو نجی ایجنسیوں پر کنٹرول کے لیے مزید فیصلہ کن انداز میں مداخلت کرنی ہوگی تاکہ سماجی انصاف اور مساوات سے ہم آہنگ تعلیمی نظام کو یقینی بنایا جاسکے۔

درس وتدریس سے وابستہ افراد اور آمدنی کے لیے تعلیم کے شعبے میں پیسہ لگانے والے مفاد پرستوں کی ممکنہ مزاحمت کے باوجود ایک نیا ضابطہ عمل وضع کرنا ہوگا جو ایسے جدید تعلیمی نظام کا پیش خیمہ ثابت ہو جو باعتبار مواد سیکولر، عملاً جمہوری اور اصولاً بین الموضوعاتی ہو۔ **(بشکریہ: دی ہندو، 9 مئی 2009)**

□□□

مترجم کا نام اور پتہ:
شہیم خاں
Deptt. of Urdu. Delhi University, Delhi-110007

رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی

مرتب: ڈاکٹر وشوامترا اپادھیائے / مترجم: احسان احمد صدیقی

رام پرشاد نے یہ آپ بیتی گورکھ پور جیل میں اپنی پھانسی 19 دسمبر 1927 کے دو دن قبل مکمل کی تھی۔ رام پرشاد بسمل کے سینے میں جو آگ تھی اور جو مقصد پیش نظر تھا اس کا خلاصہ انھوں نے اس آپ بیتی میں بیان کیا ہے جس میں ان کی اپنی مفلوک الحال خانگی زندگی، نامساعد ایام، ایام جوانی، ازدواجی زندگی، والدین اور مذہبی وسیاسی تعلیمات کے ساتھ اپنے اندر پیدا ہونے والے حب وطن کے جذبے کی وجوہات، کاکوری ریلوے ڈکیتی، اپنی گرفتاری، جیل کے واقعات، پھانسی کی کوٹھری اور زندگی کے آخری لمحات کی باتیں بڑی دل خراش ہیں۔

صفحات: 109، قیمت -/33 روپئے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبه اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

محمد حسن فاروقی

مہاراشٹر میں اردو تعلیم

ہندوستان میں مہاراشٹر، کرناٹک اور بہار میں اردو ذریعۂ تعلیم کے اسکول بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ 2001 کی مردم شماری کی روشنی میں مہاراشٹر کی کل آبادی نو کروڑ اڑسٹھ لاکھ اٹہتر ہزار چھ سو ستائیس ہے اور یہ ریاست آبادی کے لحاظ سے ملک میں دوسرے نمبر پر ہے۔ یہاں خواندہ افراد کی تعداد چھ کروڑ اتنالیس لاکھ پینسٹھ ہزار نو سو سینتالیس ہے۔ مہاراشٹر میں ایک کروڑ دو لاکھ ستر ہزار چار سو پچاسی مسلمان آباد ہیں۔ گویا ان کی آبادی کا تناسب 10.6 فیصد ہے۔ ان کی خواندگی کی شرح 78.1 فیصد ہے۔ اس طرح مسلمانوں کی مجموعی شرح خواندگی ریاست کی مجموعی شرح خواندگی سے تقریباً بارہ فی صد زیادہ ہے۔ یہ حقیقت ذہن نشیں رہے کہ عموماً مسلمانوں کی مادری زبان اردو ہی ہے۔ ان کی خواندگی کی یہ اونچی شرح اردو داں طبقے کے احساسِ کمتری کو کم کرنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

سہولت کے پیش نظر اردو تعلیم کو دو خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اوّل یہ کہ تمام مضامین اسی زبان میں پڑھائے جائیں۔ دوم اس زبان کا مطالعہ بطور ایک مضمون کے کیا جائے۔ ریاست میں پرائمری ثانوی اور کچھ حد تک اعلیٰ ثانوی سطح پر بھی اردو ذریعۂ تعلیم ہے اور طلبہ کی کثیر تعداد ان اداروں میں جہاں ذریعۂ تعلیم اردو ہے زیر تعلیم ہے۔ یونیورسٹی کی سطح پر جو طلبہ گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کے لیے اردو بحیثیت خصوصی مضمون اختیار کرتے ہیں ان کا ذریعۂ تعلیم (Medium of Instruction) بھی اردو ہوتا ہے۔ یونیورسٹیوں میں اردو بحیثیت ایک مضمون بھی شامل نصاب ہے۔

ذیل کے جائزے سے مہاراشٹر میں اردو تعلیم کی صورت حال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

فی الحال پورے مہاراشٹر میں اردو ذریعۂ تعلیم کے تین ہزار سے زائد پرائمری اسکول چل رہے ہیں۔ ثانوی مدارس کی تعداد 935 اور جونیئر کالجوں کی تعداد 230 ہے۔ ڈی ایڈ کالج 42 ہیں۔ تقریباً 25 بی ایڈ کالجوں میں بحیثیت ایک اختیاری مضمون کے اردو کی تدریس کا انتظام ہے۔

ریاست مہاراشٹر کے کئی بڑے شہر اردو تعلیم کے اہم مراکز ہیں۔ اردو تعلیمی اداروں کی تعداد کے لحاظ سے ممبئی ان سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ ممبئی کارپوریشن کے تحت 205 اردو پرائمری اسکول قائم ہیں جن میں کم و بیش ڈیڑھ لاکھ طلبہ و طالبات زیر تعلیم ہیں۔ پرائیویٹ پرائمری اسکول 65 ہیں۔ اس شہر میں اردو کے 109 ہائی اسکول اور 12 نائٹ ہائی اسکول چل رہے ہیں۔ تعلیم کے دیگر اہم مراکز ہیں: مالیگاؤں، اورنگ آباد، بھیونڈی، ناگپور اور پونہ

گذشتہ پندرہ بیس برسوں کے ایس ایس سی کے نتائج کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مراکز کے اسکولوں کے نتائج ایس ایس سی بورڈ کے مجموعی نتائج سے بیس پچیس فیصد زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ ایس ایس سی امتحان میں اردو میڈیم کے طلبہ پورے مہاراشٹر میں اوّل پوزیشن حاصل کرتے رہے ہیں۔ ایس ایس سی بورڈ کے آٹھ ڈویژنوں میں مارچ 2008 میں اردو میڈیم کے ستاون ہزار ایک سو ایک طلبہ اور طالبات شریک امتحان ہوئے اور اکیاون ہزار اکیاسی طلبہ و طالبات نے کامیابی حاصل کی۔

ادارہ بال بھارتی (پونہ) پوری ریاست کے لیے پہلی سے آٹھویں جماعت کی درسی کتابیں آٹھ زبانوں میں شائع کرتا ہے۔ اس ادارے سے ریاستی زبان مراٹھی کے بعد سب سے زیادہ شائع ہونے والی کتابیں اردو کی ہوتی ہیں اور یہاں تیار ہونے والی اردو درسیات کے بلند معیار کو پورے ملک میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ بال بھارتی سے شائع ہونے والی کتابوں کی تعداد سے اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ آئندہ تعلیمی سال یعنی 2010-2009 کی ضرورت کے پیش نظر اردو زبان اول کے لیے شائع ہونے والی کتابوں کی تعداد حسب ذیل ہے:

جماعت اوّل: دو لاکھ بیس ہزار

دوم: دو لاکھ

سوم: دو لاکھ چالیس ہزار

چہارم: دو لاکھ تیس ہزار

پنجم: ایک لاکھ ساٹھ ہزار

ششم: ایک لاکھ پچپن ہزار

ہفتم: ایک لاکھ پچھتر ہزار

ہشتم: دو لاکھ

ایس ایس سی بورڈ کے تحت اردو زبان اول کے لیے شائع ہونے والی درسی کتابوں کی تعداد ذیل کے مطابق ہے:

جماعت نہم: باون ہزار، جماعت دہم: اڑتالیس ہزار

یازدہم: بتیس ہزار، دوازدہم: تیس ہزار

انگریزی میڈیم کے پانچویں تا دسویں کے طلبہ اردو (کمپوزٹ کورس) بطور ایک اختیاری مضمون کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ ادارہ بال بھارتی اس کی تدریس کے لیے پنجم تا ہشتم جماعتوں کے لیے دس دس ہزار کتابیں شائع کرتا ہے۔ ممبئی کے اردو نواز حضرات مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ انگریزی میڈیم اسکولوں میں اختیاری مضمون اردو کی سہولت فراہم کرنے کی مہم چلا رہے ہیں۔

پرائمری سطح کے لیے نصاب بنانا، اساتذہ کے لیے تربیتی پیکیج تیار کرنا اور اساتذہ کو درس وتدریس کی تربیت دینا ایس سی ای آر ٹی کی ذمے داری ہے۔ یہ سارے کام اردو میں بھی انجام پاتے ہیں۔

مہاراشٹر کی 9 یونیورسٹیوں میں اردو ریسرچ کی سہولت موجود ہے۔ کئی کالجوں میں گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن سطح تک اردو کی پڑھائی کا انتظام ہے۔ ریاست کی مختلف یونیورسٹیوں سے اردو میں ایم اے کرنے والوں کی تعداد ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔

حکومت مہاراشٹر کے محکمہ تعلیم کی طرف سے چوتھی اور ساتویں جماعتوں کے لیے سرکاری سطح پر ہونے والے اسکالرشپ امتحانات ایلیمنٹری اور انٹرمیڈیٹ ڈرائنگ امتحان اور Mh. CET کے امتحان کے سوالی پرچے اردو میں بھی فراہم کیے جاتے ہیں۔ اردو داں طلبہ کو بی ایڈ کے امتحانی پرچوں کے جوابات اردو میں لکھنے کی اجازت حاصل ہے۔

مہاراشٹر میں اردو زبان اور اردو ذریعۂ تعلیم کے فروغ میں مختلف اداروں نے قابل ستائش کوششیں کی ہیں۔ اس ضمن میں انجمن اسلام ممبئی، انجمن خیر الاسلام ممبئی، اعظم کیمپس پونہ، اقرا ایجوکیشن سوسائٹی جلگاؤں، انجمن اشاعت الاسلام ناندیڑ، تنظیم والدین اردو مدارس، دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ پونہ، تنظیم والدین ممبئی اور MESCO ممبئی نے انتہائی وقیع خدمات انجام دی ہیں۔ تعلیمی بیداری پیدا کرنے اور کیریئر گائیڈنس کے سلسلے میں مبارک کاپڑی کی انتھک کوششوں کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے زیر انصرام فاصلاتی طرز تعلیم کے ذریعے اردو کی اعلیٰ تعلیم بی.اے.، ایم.اے.، بی ایس سی، بی ایڈ وغیرہ کی راہیں ہموار ہوئی ہیں۔ اس یونیورسٹی نے اعلیٰ سطح پر مختلف مضامین کے لیے اردو میں مواد تیار کر کے طلبہ کو فراہم کیا ہے۔ اس یونیورسٹی کے 23 اسٹڈی سینٹر مہاراشٹر میں موجود ہیں۔ ملک کی کسی بھی دوسری ریاست میں اتنے اسٹڈی سینٹر نہیں ہیں۔ ریاست مہاراشٹر قومی اردو کونسل، نئی دہلی کی مختلف اسکیموں سے بھی فائدہ اٹھا رہی ہے اور ریاست میں قومی اردو کونسل کے مختلف مراکز ان اسکیموں کے ذریعے اردو داں طبقے کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔

اس سرسری جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاراشٹر میں اردو تعلیم کی صورت حال انتہائی حوصلہ افزا ہے اور اسے اردو اداروں کی کثرت اور اردو کے فروغ کی وجہ سے ملک کی دوسری ریاستوں پر فوقیت حاصل ہے۔ لیکن صرف تعلیمی اداروں کی عددی کثرت پر مطمئن ہو جانا کسی طرح مناسب نہیں۔ تعداد (Quantity) کبھی بھی معیار کا نعم البدل نہیں بن سکتی۔ اس مسئلے پر علیحدہ سے گفتگو کی ضرورت ہے۔ □□□

پتہ:
574, Bail Bagh, Guru Warad.
Malegaon, Nasik

منتخب التواریخ (جلد اوّل، دوم وسوم)

مؤلف: ملا عبدالقادر بدایونی/مترجم: ڈاکٹر علیم اشرف خاں

عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی نہ صرف باکمال شاعر تھے بلکہ تاریخ نویسی میں بھی انھیں ملکہ حاصل تھا۔ معروف مورخ ابوالفضل کے ہمعصر ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں بھی اکبری دربار میں رسائی حاصل تھی۔ انھیں ترجمہ اور تالیف پر مامور کیا گیا تھا۔ اسی دوران انھوں نے تاریخ الفی، رزم نامہ، جامع رشیدی اور بحرالاسمار جیسی کتابیں لکھیں۔ اکبری عہد کی ساٹھ سالہ تاریخ سے آگاہی کے لیے ابوالفضل کے ''اکبرنامہ'' کے ساتھ ساتھ ملاّ عبدالقادر کی ''منتخب التواریخ'' (تین جلدوں میں) کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ملاّ عبدالقادر نے یہ تاریخ شاہی محل میں بیٹھ کر نہیں لکھی جو بادشاہ اکبر کی پسند و ناپسند سے گزرتی بلکہ آزادانہ تحریر کی اور یہی آزادانہ رائے اس کتاب کو ''اکبرنامہ'' سے منفرد کرتی ہے۔

صفحات: جلد اوّل 409/ جلد دوم وسوم 620، قیمت: جلد اوّل-/335 روپے/ جلد دوم وسوم 555 روپے

شاہد اختر

مغربی بنگال میں اردو

اردو کی لسانی و ادبی تاریخ میں کولکاتا کو فورٹ ولیم کالج (قائم شدہ 1800) اور مرشد آباد کو انشاء اللہ خاں کی وجہ سے ایسی شہرت حاصل ہوئی کہ ان دو مقامات سے الگ بنگال کے کسی گوشے میں اردو کی موجودگی کا احساس تک باقی نہیں رہا۔ آج بھی بنگال سے باہر اردو کا مرکز کولکاتا کو ہی سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان کے شمال مغرب میں بیٹھا ہوا اردو والا ہو یا جنوب یا مغرب کے ساحل پر مقیم کوئی اردو خواں، سوچ بھی نہیں سکتا کہ کولکاتا سے آٹھ سو کیلو میٹر شمال اور سطح سمندر سے ساڑھے سات ہزار فٹ کی بلندی پر واقع دارجلنگ بھی اردو زبان کے مساکن میں سے ایک ہے۔ بنگال کے دور افتادہ اضلاع کی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں جلنے والے اردو کے چراغوں کی لو اردو والوں تک نہیں پہنچ پاتی۔

مغربی بنگال کے اضلاع میں اردو کی صورت حال کا ایک اجمالی جائزہ پیش خدمت ہے تاکہ اردو کے عام قارئین کے ساتھ ادبی اور لسانی تاریخ کے محققین تک کی وسعت نگاہ کا سامان ہو سکے۔

مغربی بنگال کی راجدھانی کولکاتا کو خود ضلع کی حیثیت حاصل ہے۔ بشمول کولکاتا مغربی بنگال میں کل 19 اضلاع ہیں۔ جنوبی چوبیس پرگنہ، شمالی چوبیس پرگنہ، ندیا، مرشد آباد، مالدہ، جنوبی دیناج پور، شمالی دیناج پور، جلپائی گوڑی، کوچ بہار، دارجلنگ، مغربی مدنی پور، ہوڑہ، ہگلی، بردوان، بیر بھوم، بانکوڑہ اور مغربی مدنی پور وہ اضلاع ہیں جن میں سے بعض میں اردو بولنے والوں کی تعداد بمنزلہ صفر ہے، بقیہ اضلاع میں اردو سمجھی، بولی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔ دارجلنگ ضلع میں دارجلنگ، کرسیانگ اور سلی گوڑی میں اردو داں اچھی خاصی تعداد میں آباد ہیں۔ دارجلنگ شہر کی کل آبادی کے دس فیصد اردو والوں میں سے آدھے بہار اور مشرقی اتر پردیش کے رہنے والے ہیں۔ یہ اردو تہذیب سے اپنی وابستگی پر فخر کرتے ہیں۔ اردو کو اردو لہجے میں بولتے ہیں۔ ایک دن کی تاخیر سے پہنچنے والے اردو اخبار کو آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ بقیہ نصف اتر پردیش کے اردو علاقوں سے تعلق رکھنے والے وہ افراد ہیں جو اردو میں نیپالی لہجے کی آمیزش اس طرح کرتے ہیں کہ بعض اوقات یہ تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ اردو بول رہے ہیں یا نیپالی۔ انگریزی میڈیم اسکولوں کی فراوانی ہے۔ اول الذکر اپنے بچوں کو گھر میں اردو پڑھاتے ہیں۔ آخر الذکر اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ کوئی ملی تقریب یا معاشرتی کام ہو تو مل جل کر کرتے ہیں۔ انجمن اسلامیہ ایک ایسی تنظیم ہے جس سے سبھی وابستہ ہیں۔ انجمن اسلامیہ کی عمارت سے متصل اردو میڈیم کا ایک جونیئر ہائی اسکول ہے جو نہ جانے کن علاقائی سیاستوں کا شکار ہو کر گذشتہ 50 برسوں میں بھی اپ گریڈ نہیں ہو سکا۔ ذاکر حسین بستی میں لڑکیوں کے لیے ایک مکتب ہے جو تعلیم نسواں کی ضرورت کی کسی حد تک تکمیل کر رہا ہے۔ دو تین ہائی اسکول ہیں جہاں اردو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھنے کی سہولت ہے۔ تمتی مسلمان اردو کو مسلم تہذیب کی ترجمان سمجھ کر اردو سے پیار کرتے ہیں۔ یہ طبقہ امیر ہے۔ ان کے اکثر بچے ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ یا جامعہ بھیج دیے جاتے ہیں۔ دارجلنگ گورنمنٹ کالج میں بی اے کی سطح پر اردو تعلیم کا نظم ہے۔ سیاسی صورت حال بگڑنے سے قبل طلبہ کی اچھی خاصی تعداد میدانی علاقوں سے حصول علم کے لیے آتی تھی، اب آنے سے گریز کرتی ہے۔ کرسیانگ میں اردو تعلیم کا کوئی معقول نظم نہیں ہے۔ مسجد کے امام صاحب سے قرآن کے علاوہ اردو کی ابتدائی کتابیں پڑھوائی جاتی ہیں۔ سلی گوڑی شمالی مشرقی ہندوستان کا اہم تجارتی مرکز ہے۔ یہاں اردو والے آباد ہیں۔ کاروباری ذہنیت غالب ہونے کے باوجود تعلیم کا رجحان ہے۔ سلی گوڑی میں سرکار سے منظور شدہ ہائی اسکول (ہائر سکنڈری) اردو تعلیم کا واحد کامیاب مرکز ہے۔ یہاں جس تیزی سے اردو والوں میں تعلیمی رجحان فروغ پا رہا ہے اس کو دیکھ کر عنقریب سلی گوڑی میں ایک اور ہائی اسکول کی ضرورت محسوس کی جائے گی۔ شمالی دیناج پور جغرافیائی طور پر پورنیہ، کشن گنج اور کٹیہار سے متصل ہے۔ یہاں کے اردو والوں کی زبان اردو ہوتی ہے، لہجے پر بنگلہ اور سیما چل کی بولیوں کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ پھر بھی اپنے آپ کو اردو داں لوگوں میں شریک کر کے فخر محسوس کرتے ہیں۔ جن علاقوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملنے کے امکانات ہیں ان میں ایک اسلام پور بھی ہے جہاں چار ہائی اسکول ہیں۔ اسلام پور کالج میں اردو کی پڑھائی کا نظم بہت دنوں سے ہے۔ یہاں کی اردو آبادی میں بیکاری کی وجہ سے بہت مایوسی رہتی ہے مگر دوسری سرکاری زبان کا وعدہ پورا ہونے پر سرکاری دفاتر میں اردو داں افراد کی خاطر خواہ بحالی سے مایوسی دور ہو سکتی ہے۔ مالدہ ضلع کے قصبہ پانڈوا کو بڑی شہرت حاصل ہے۔ یہاں حضرت مخدوم اشرف سمنانی رحمتہ اللہ علیہ کے پیر و مرشد حضرت علاء الحق پانڈوی رحمتہ اللہ علیہ کا آستانہ ہے۔ یہ مقام کبھی اردو فارسی کا بڑا مرکز تھا، آج اردو سمجھنے والے بھی خال

خال ہیں۔ مالدہ کی بڑی سیاسی شخصیت مرحوم ابوالبرکات غنی خان چودھری کا خاندان لکھنؤ سے مالدہ منتقل ہوا تھا۔ آج اس خاندان کا کوئی بھی فرد نہ اردو بول سکتا ہے نہ اردو سمجھ سکتا ہے۔ دینی مدارس بہت ہیں۔ کسی کسی دینی مدرسے میں اردو بھی پڑھائی جاتی ہے۔ اردو اس ضلع میں بھی سانس لے رہی ہے۔ انشاء اللہ خاں انشاء اور میر باقر مخلص مرشد آبادی کا مرشد آباد، محدود پیمانے پر ہی سہی اردو زبان و ادب کو بچائے رکھنے میں کامیاب ہے۔ نواب بہادر انسٹی ٹیوشن واحد گورنمنٹ ہائی اسکول ہے جہاں بارھویں درجے تک اردو تعلیم کا بندوبست ہے۔ کالج کی سطح پر نیتاجی سبھاش کالج میں اردو تعلیم کا معقول نظم ہے۔ کبھی کبھار ادبی محفلیں بھی ہوتی ہیں۔ بقیہ پورے ضلع میں اردو کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔

بیربھوم ضلع کا صدر مقام سیوڑی ہے جہاں اردو بولنے والے افراد اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں مگر اپنے بچوں کو بنگلہ پڑھاتے ہیں۔ سیوڑی، پاتھر چوپڑی اور دوب راج پور کے دینی مدرسے اردو کا چراغ جلائے ہوئے ہیں۔ سینتھیا، رامپورہاٹ اور احمد پور ضلع میں اردو والوں نے گھر کی زبان اردو رکھی ہے۔ بول پور سے متصل رابندر ناتھ ٹیگور کی نگری شانتی نکیتن کی عالمی شہرت یافتہ وشوا بھارتی یونیورسٹی میں اردو، عربی، فارسی اور اسلامی ثقافت کے شعبے ہیں۔ انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ سطح پر اردو نہیں پڑھائی جاتی لیکن اردو میں اعلیٰ پائے کی تحقیق کا کام اس یونیورسٹی سے ہو رہا ہے۔ اردو شعبے کی توسیع ان کی ترجیحات میں شامل ہے گذشتہ مارچ میں ''بنگال میں اردو زبان و ادب کا ارتقا'' کے عنوان سے دو روزہ قومی سیمینار کا اہتمام کیا گیا تھا جو بہت کامیاب رہا۔ اس میں یونیورسٹی کی جانب سے یہ خوشخبری بھی سنائی گئی کہ بہت جلد اردو کا شعبہ خود مختار اور آزاد ہو جائے گا۔ اگر ایسا ہو گیا تو یہ بڑا کام ہوگا۔ اردو کو بنگال میں ایک مضبوط ٹھکانہ مل جائے گا۔ مغربی مدنی پور میں اردو کا چلن سرے سے نہیں ہے۔ مشرقی مدنی پور میں کھڑگ پور ہی ایک ایسا علاقہ ہے جہاں اردو بولی بھی، لکھی اور پڑھی جاتی ہے۔ 3 پرائمری اسکول اور ایک ہائی اسکول اردو تعلیم کی کل کائنات ہیں۔ اس ہائی اسکول کی منظوری بھی وہاں کے موجودہ اردو استاد کی انتھک محنت کا ثمرہ ہے۔ اردو آبادی تعلیم کی بہتر سہولت کے مطالبات رکھتی ہے اور پر امید بھی ہے کہ کھڑگ پور کالج یا ودیا ساگر یونیورسٹی میں اردو تعلیم کا بندوبست ہو جائے گا۔

پرولیا ضلع تین طرف سے جھارکھنڈ اور ایک طرف سے بردوان ضلع کی اردو آبادی سے قربت کی وجہ سے اچھی خاصی اردو آبادی رکھتا ہے۔ آدرا میں اردو والے ہیں مگر کوئی اردو اسکول نہیں۔ مدارس دینیہ میں اردو تعلیم کا بندوبست ہے مگر ظاہر ہے کہ وہاں کے فارغین اعلیٰ تعلیم کی سہولتوں سے بہرہ ور نہیں ہو پاتے۔ پرولیا کالج اور جے پولیا کالج میں اردو طلبہ کا داخلہ اس شرط پر ہوتا ہے کہ انھیں 50 نمبر کی اردو کمپلسری پر اکتفا کرنا ہوگا اور اس کی تیاری بھی خود سے کرنی ہوگی۔

جنوبی چوبیس پرگنہ کی بج بج اور باٹا نگر صنعتی پٹیوں میں اردو آبادی بہ طور ذریعہ تعلیم کوئی دوسری زبان اختیار کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ زبان کی زندگی کا ثبوت جلسوں میں اردو واعظین کی شرکت اور چائے کی دکانوں میں اردو اخبارات کی آمد سے ملتا ہے۔

اب ان اضلاع کا جائزہ لیتے ہیں جنھیں اردو بستیوں کے اضلاع کے نام سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے۔ ایسے اضلاع میں بردوان، ہگلی، ہوڑہ اور شمالی چوبیس پرگنہ ہیں۔ بردوان ضلع کی اردو بستیاں کلٹی، نعمت پور، آسنسول، برنپور، (دھرم پور، عالم گنج اور رحمت نگر سمیت) رانی گنج، انڈال اور درگا پور ہیں۔ کلٹی کی اردو آبادی سماجی اور معاشرتی سرگرمیوں میں گہری دلچسپی رکھتی ہے۔ پرائمری اسکول علاقائی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ لڑکوں کے لیے کینڈوا بازار ہائر سکنڈری اسکول (ہائی لنگول) اور لڑکیوں کے لیے ملت گرلز ہائی اسکول اچھے تعلیمی مراکز ہیں۔ ملت گرلز ہائی اسکول چند بیدار مغز اور علم دوست حضرات کی کاوشوں اور عوام کی بھرپور حمایت کی یادگار ہے۔ کلٹی کالج میں اردو شعبے کا دیرینہ خواب غالباً اسی سال پورا ہونے کو ہے۔ اب تک اونچی تعلیم کے لیے یہاں کے بچوں کو آسنسول، رانی گنج یا پھر جھارکھنڈ کے مائتھن جانا پڑتا تھا۔ نعمت پور کی اردو آبادی سیتارام پور کے ترائی لنگول ہائی اسکول میں بچوں کو داخلہ دلاتی ہے۔ ان دنوں وہاں کے پڑھے لکھے نوجوانوں کو کچھ سرگرم سماجی اور سیاسی مسلم رہنماؤں کی سرپرستی حاصل ہے اور امید ہے کہ بہت جلد وہاں کے اردو داں افراد اپنا ایک تعلیمی ٹرسٹ قائم کر کے ایک بڑا کام انجام دیں گے۔ آسنسول بھی ان علاقوں میں سے ایک ہے جہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنائے جانے پر اتفاق ہو چکا تھا لیکن جیوتی باسو کابینہ کی مہر تصدیق ثبت ہونے سے قبل ہی اس ڈرافٹ کو سرد خانے میں ڈال دیا۔ آسنسول کی اردو آبادی دو علاقوں میں تقسیم ہے۔ بازار سائڈ میں ہاٹن روڈ، بسٹن بازار، اسلام پور اور بودا کے علاقے ہیں۔ ریل پار میں جہانگیری محلہ، چربی محلہ، مصدی محلہ، نئی بستی، اور قریشی محلہ آباد ہیں۔ گھنی آبادی، ہر محلے میں پرائمری اسکول، ہر پرائمری اسکول میں بچوں کی تعداد خاطر خواہ، ایک ایسا پرائمری بھی ہے جس میں 17 منظور شدہ اساتذہ ہیں۔ رحمانیہ ہائی سکنڈری اسکول، ربانیہ گرلز ہائی سکنڈری اسکول، حاجی قدم رسول ہائی سکنڈری اسکول اور عیدگاہ ہائی اسکول۔ دانش گاہ اسلامیہ ملی شناخت کے ساتھ قائم اقلیتی اسکول ہے۔ انگریزی اسکولوں کی تعداد بھی خاصی ہے مگر اردو پڑھانے کا رجحان قابل قدر ہے۔ کئی کوچنگ سنٹر اور کیریئر کاؤنسلنگ کے مراکز بھی ہیں۔ مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کا اسٹڈی سنٹر

بھی قائم ہے ۔آسنسول بدھان چندر کالج میں اردو آنرز کی سطح تک تعلیم دی جاتی ہے۔ ایک کل وقتی اور تین جز وقتی اساتذہ طلبہ اور طالبات کی ایک بڑی تعداد کو سنبھالتے ہیں ۔ بی بی کالج میں گذشتہ 15 برسوں سے اردو طلبہ کو داخلے کی اجازت تو ہے مگر ایک جز وقتی استاد سے کام چلایا جاتا ہے ۔ پہلے مرحوم عابد ضمیر اس کام کو عبادت سمجھ کر کرتے تھے، اب ڈاکٹر مشتاق اعظمی ان کی سنت ادا کر رہے ہیں۔ جھوڑیہ میں بہت تگ و دو کے بعد ایک جونیئر ہائی اسکول کا تحفہ اردو والوں کو مل سکا ہے۔ سری پور، جے کے نگر وغیرہ میں اردو آبادی ہے مگر اردو اسکول نہیں ہیں ۔ برنپور، رحمت نگر، عالم نگر، دھرم پور اور نئی بستی کی کثیر اردو آبادی پہلے برنپور کے اس اسکول سے استفادہ کرنے پر مجبور تھی جس میں کبھی مولانا احمد اللہ صاحب جیسے عالم دین استاد ہوا کرتے تھے پھر محبوب انور جیسا زبان کا ماہر اس کا استاد ہوا۔ ان کی سبکدوشی کے بعد ابھی غالباً کسی کل وقتی استاد کی تقرری نہیں ہوئی ہے مگر اب رحمت نگر میں رحمت نگر ہائر سکنڈری اسکول اور اقبال اکیڈمی نے کسی حد تک علم کے پیاسوں کی سیرابی کا انتظام کر دیا ہے ۔ یہاں کے طلبہ و طالبات کو کالج کی تعلیم کے لیے بی. بی سی یا ٹی ڈی بی کالج کے دروازوں پر دستک دینا پڑتا ہے جو ان آبادیوں سے دور ہیں۔ رانی گنج میں ساٹھ سے ستر ہزار اردو آبادی کے لیے گیارہ پرائمری اسکول ہیں جن میں سے ایک مخدومیہ پرائمری اسکول کو دارجلنگ مکتب کے بعد بنگال میں لڑکیوں کے لیے قدیم پرائمری اسکول ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ رانی گنج ہائی سکنڈری اسکول اور لڑکیوں کے لیے انجمن گرلز ہائر سکنڈری اسکول اچھی درسگاہیں ہیں ۔

ایم اے کی تعلیم کے لیے آسنسول اور رانی گنج کے طلبہ اور طالبات کو کولکاتا جانا پڑتا تھا ۔گذشتہ سال سے ہگلی محسن کالج آنا پڑتا ہے جو تقریباً 120 کیلو میٹر کی دوری پر واقع ہے ۔انڈال، ایسٹرن ریلوے کے ملازمین اور کچھ تجارت پیشہ اردو داں لوگوں کا مسکن ہے ۔ایک ہائی اسکول کی منظوری کے بعد تعلیمی رفتار میں تیزی آئی ہے ۔درگا پور کا دامن اردو اسکولوں سے خالی ہے ۔ایک دینی درسگاہ اردو کا چراغ جلائے ہوئے ہے ۔درگا پور گورنمنٹ کالج کسی اردو داں رہنما کی نظر التفات کے انتظار میں ہے ۔ بردوان شہر میں اردو والے اچھی تعداد میں موجود ہیں مگر اردو کی طرف ان کی کوئی توجہ بھی نہیں ہے۔

ہگلی ضلع کے تاریخی مقام پنڈوا کی قدیم اردو آبادی گھروں میں اردو بولتی ہے۔ اردو اخبارات پڑھتی ہے مگر بچوں کو بنگلہ زبان پڑھاتی ہے۔ وہاں کے مشہور سلطانیہ ہائی اسکول میں اردو ایک مضمون کی حیثیت سے بھی شامل نہیں ہے۔ رہائشی تنگی نے کولکاتا سے بہت سارے لوگوں کو پنڈوا آباد ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ نئی آبادی اردو اسکول کے قیام کے لیے بے چین ہے۔ اللہ کرے ان کی کوشش کامیاب ہو جائے ۔ایک غیر منظور شدہ اسکول ڈاکٹر مختار احمد انصاری اسکول بہت دنوں سے اپنی منظوری کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ وہاں کے طلبہ و طالبات کو دوسری جگہوں سے مدھیامک امتحان میں بیٹھنے کے جتن کرنے پڑتے ہیں ۔آئی ایم ہائی مدرسہ کی منظوری سے قبل وہاں کے طلبہ اور طالبات کو ہگلی کے گور ہری ہریجن اسکول میں داخلے کی محتاجی تھی ۔ وہاں کی انتظامیہ نے اردو طلبہ کے لیے اپنے دروازے کھول رکھے تھے ۔ کالج کی تعلیم کے لیے ہگلی محسن کالج کے علاوہ مگرہ کے باگھا گاچھی کالج میں بھی داخلہ ملتا ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ اردو کی تیاری خود سے کرنی ہوگی ۔ڈنلپ اور بنڈیل کی اردو آبادی کو ماضی قریب تک مہاتما گاندھی اسکول میں ایک اردو استاد مل جایا کرتا تھا ۔ اب یہ سلسلہ موقوف ہے ۔ہگلی چنسورہ میں گھر کی زبان اردو ہے (بعض گھروں میں یہ بھی نہیں) تعلیم کی زبان بنگلہ ہے ۔چوک بازار میں ہگلی امام بارہ میں قائم حوض علیہ اردو فارسی کا چراغ روشن رکھنے میں منہمک ہے مگر استفادہ بیرونی لوگ کر رہے ہیں ۔

چنسورہ میں حاجی محسن صاحب کا قائم کردہ ہگلی مدرسہ (1817) اور ہگلی محسن کالج (1836) شاندار ماضی کی یادگاریں بھی ہیں اور اردو زبان کے قلعے بھی ہیں ۔ہگلی محسن کالج میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم کا انتظام ہے ۔ چندن نگر میں اردو کے دو محلے خاص ہیں ۔اردی بازار اور پادری پاڑہ، ان دو محلوں کی مجموعی آبادی کے لیے مولانا آزاد پرائمری اور مولانا آزاد اردو جونیئر ہائی اسکول ہیں ۔مالدار لوگ اپنے بچوں کو بنگلہ ،انگلش یا فرنچ پڑھاتے ہیں۔ غریبوں کے بچوں کو اونچی تعلیم کے زینے تک پہنچانے کے لیے ایک ہی عمارت میں چلنے والے یہ دو اسکول ہیں۔ چندن نگر کالج میں جغرافیہ جیسے اچھے مضمون میں اردو داں کا داخلہ اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ وہاں اردو تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ تیلنی پاڑہ، پھاٹک پاڑہ، بھدریشور کی تقریباً 70 ہزار کی اردو آبادی میں کل پانچ پرائمری، ایک ہائر سکنڈری اسکول اور ایک غیر منظور شدہ جونیئر ہائی اسکول قاسم العلوم ہے ۔

انکس ، چاپدانی کی کم وبیش ایسی ہی گنجان آبادی میں ادبی سوسائٹی ہائی مدرسہ اور چاپدانی جونیئر ہائی اسکول کے علاوہ دو معیاری درس گاہیں اقرا ماڈل اکادمی اور مولا عبدالولی اسکول ہیں جن میں جونیئر ہائی کی تعلیم ہوتی ہے ۔انیس اکادمی بھی اسی طرز کی درسگاہ ہے۔ دو پرائمری اسکول ہیں ۔ہائی اسکول کی تعلیم کے لیے یہاں کے بچوں کو بارک پور یا رشڑا جانا ہوتا ہے ۔رشڑا بھی کثیر اردو آبادی کا علاقہ ہے ۔رشڑا اودیا پیٹھ میں ایک اردو استاد رشڑا کی اردو آبادی سے ہائی اسکول پہنچنے والے لڑکوں کا سہارا بنتے تھے ۔وہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا ۔اب انجمن ہائی اسکول رشڑا اس خلا کو پر کر رہا ہے ۔ضرورت ہے کہ اسے ہائر سیکنڈری

کا درجہ ملے رشڑا کے بدھان چندر کالج میں 70 کی دہائی میں اردو والوں کا داخلہ ہوتا تھا۔ایک جز وقتی استاد بھی ہوا کرتے تھے۔یہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔اس سلسلے میں غالباً اردو آبادی کی طرف سے کوئی مطالبہ بھی نہیں ہے۔ہوڑہ میں پیل خانہ،ٹکیہ پاڑہ،شیب پور(چوڑا) قاضی پاڑہ اور ناظر گنج اردو کی بستیاں ہیں۔پیل خانہ میں حلیمن میموریل ہائی اسکول،ٹکیہ پاڑہ میں ہوڑہ مسلم ہائی اسکول،شیب پور میں ہوڑہ ہاٹ ہائر سکنڈری اسکول اور ہوڑہ ہائی اسکول۔شیب پور میں ایک منظور شدہ جونیئر ہائی مدرسہ بھی ہے۔انجمن فیض الغربا میں ایک اردو اسکول قائم ہے۔ہوڑہ کے دینا بندھو کالج اور نرسنہا دتہ کالج میں اردو بی اے سطح تک پڑھائی جاتی ہے۔آنرز کا مطالبہ پرانا ہے۔دیکھیے کب پورا ہوتا ہے۔

شمالی 24 پرگنہ کا ایک علاقہ کمرہٹی تقریباً ڈیڑھ لاکھ اردو بولنے والوں کا علاقہ ہے۔یہاں صرف دو منظور شدہ ہائی اسکول کمرہٹی ہائی اسکول اور سلیمیہ ہائر سکنڈری اسکول ہیں۔قریبی علاقے عالم بازار میں جو ممبر پارلیمنٹ محمد امین صاحب کا محلہ ہے،محض ایک ہائی اسکول ہے۔ان علاقوں کے اردو طلبہ کا داخلہ قریبی بھیرب دتہ گانگولی کالج میں ہوتا ہے جہاں گذشتہ تین برسوں سے جز وقتی استاد ہی آنرز کا بھار بھی اٹھانے ہوئے ہیں۔کھردہ،ٹیٹا گڑھ اور بارک پور ایک دوسرے سے ملے ہونے علاقے ہیں۔یہاں منظور شدہ ہائی اسکولوں کی تعداد 5 ہے۔

گارولیا کی اردو آبادی ایک سو سال سے گارولیا مل ہائی اسکول سے استفادہ کررہی ہے۔گارولیا مل ہائی اسکول ایک زمانے تک تیلنی پاڑہ،انکس اور چاپدانی کے اردو والوں کا بھی واحد سہارا تھا۔فعال سماجی اور ادبی تنظیمیں گارولیا کی اردو آبادی میں حرکتیں پیدا کرتی رہتی ہیں۔جگتدل کا چشمہ رحمت ہائر سکنڈری اسکول تقسیم کے نتیجے میں ہونے والے ترک وطن کے دردناک انجام کا نمونہ ہے۔پھر بھی اردو کا شعبہ یہاں آج بھی فعال ہے۔شمس ہائی اسکول جگتدل کیلا بگان جیسی گھنی بستی میں علم کا چراغ روشن کیے ہوئے ہے۔کانکی نارہ میں حمایت الغربا ہائی اسکول اور کانکی نارہ گرلز ہائی اسکول نہ صرف کانکی نارہ بلکہ نواح کی اردو آبادی کی بھی امیدوں کا مرکز ہیں۔گوری پور اور حاجی نگر میں پچاس ہزار سے اوپر اردو آبادی کے لیے ایک بھی اردو میڈیم ہائی اسکول کا نہ ہونا افسوسناک ہے۔مارواڑی کل کے آدرش ودیالیہ میں سبکدوشی کے بعد گذشتہ پانچ چھ برسوں میں کسی کل وقتی استاد کی تقرری عمل میں نہیں آسکی۔ان علاقوں میں سماجی اور ثقافتی سرگرمیاں خوب ہیں مگر اس جانب توجہ نہیں دی جارہی ہے۔

مغربی بنگال کے اضلاع میں اردو داں آبادی اور ان کے تعلیمی وسائل پر آپ نے نظر ڈالی۔معاشی تنگی اور وسائل کی کمی کے باوجود اردو والے اپنی تہذیبی شناخت کے ساتھ جینے کی للک رکھتے ہیں۔اردو اسکولوں کے تعلیمی معیار میں بہتری لانے کی کوششیں اس لیے رائیگاں جاتی ہیں کہ ہر اسکول میں ایک ایک کلاس کے تین تین سیکشن ہیں اور ہر سیکشن میں سو سے زائد طلبہ وطالبات کو صحیح طور پر زیور تعلیم سے آراستہ کرنا مشکل ہے۔ناخواندہ افراد کی کثرت کے باوجود اردو علاقوں میں اردو اخبارات کی کھپت اچھی ہے۔ناکارہ عوامی تنظیموں کی کثرت کے باوجود ہر علاقے میں کوئی نہ کوئی سنجیدہ تنظیم کتابوں کی فراہمی،کوچنگ اور کیریئر کاؤنسلنگ کے تعمیری کام میں لگی ہوئی ہے۔سرکاری اسکیموں کا فائدہ اردو آبادی تک مشکل سے پہنچ پاتا ہے،پھر بھی مختلف اضلاع میں پھیلی ہوئی اردو کی یہ بستیاں لعل و گہر پیدا کرتی ہیں۔پبلک سروس کمیشن یونیورسٹی اور کالجوں کی اونچی کرسیوں اور اعلیٰ سرکاری عہدوں پر نظر آنے والے اردو داں افراد میں سے بیشتر انھی اضلاع سے تعلق رکھتے ہیں۔اردو ادب کے دامن کو بھی اضلاع کے صحافی،محقق،نقاد،نثار اور شاعر وسیع تر کررہے ہیں۔شمالی 24 پرگنہ کی ایک اردو بستی میں بیٹھا ہوا نوجوان بین الاقوامی معیار کا آن لائن ادبی رسالہ نکالتا ہے۔اس کا ویب سائٹ پوری دنیا میں دیکھا جاتا ہے اور اسے بین الاقوامی قارئین میسر ہیں۔ □□□

پتہ:
Deptt. of Urdu, Hugli Mohsin College,
Chilsura, Hugli (W.B.)

دیوان درد

مرتب: ڈاکٹر نسیم احمد

خواجہ میر درد اردو کے صرف صوفی شاعر ہی نہیں بلکہ ان کی غزلیہ شاعری غزل کی اس توانا روایت کا حصہ ہے جس کی نمائندگی اعلیٰ سطح پر میر تقی میر کررہے تھے لیکن افسوس کہ درد کی وفات کے بہت بعد ان کے کلام کی اشاعت ہو پائی اور وہ بھی اختلافات متن کے ساتھ۔ہندو پاک میں ''انتخاب کلام درد'' اور ''دیوان درد'' کے انھی متعدد مطبوعہ وغیر مطبوعہ نسخوں کے پیش نظر ڈاکٹر نسیم احمد نے ''دیوان درد'' کا یہ نسخہ ترتیب دیا ہے اور اس کی تفصیلی وضاحت مقدمے میں کردی ہے۔

صفحات:336، قیمت:-/160 روپے

اظہر راہی

اردو حروف تہجی کی تعداد

اردو حروف تہجی کی تعداد کا مسئلہ زبان کی پیدائش سے لے کر آج تک الجھا ہوا ہے۔ ابتدائی قاعدوں میں کہیں ان کی تعداد چھتیس شمار کی جاتی ہے تو کہیں اڑتیس۔ کچھ قاعدوں میں ہکاری آوازوں کو بھی حروف تہجی میں شمار کرلیا گیا ہے۔ اس شمار سے یہ تعداد بڑھ جاتی ہے۔

حروف تہجی سے متعلق ابتدائی مباحث کا ذکر پروفیسر ابومحمد سحر نے اپنی کتاب ''اردو رسم الخط اور املا ایک محاکمہ'' کے ایک مضمون ''اردو حروف تہجی کی تشکیل اور تعداد'' میں تفصیل سے کیا ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر سحر کے نتائج کی تفصیل اس طرح ہے۔

(1) ''دریائے لطافت'' (مرتبہ مولوی عبدالحق) میں سید انشا کے حوالے سے اردو کے حروف تہجی کی تعداد کل پچاسی بتائی گئی ہے۔ دوسری جگہ رائے میں ترمیم کرتے ہوئے یہ تعداد نوے ہوگئی ہے۔

(2) سید احمد دہلوی مرتب ''فرہنگ آصفیہ'' نے حروف کے بجائے آوازوں کی کل تعداد پچپن بتائی ہے۔

(3) اردو لغت مرتبہ ترقی اردو بورڈ، کراچی میں یہ تعداد ترپن ہے۔

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے انگریزی کے ذریعے اردو سکھانے کے لیے ایک کتابچہ Let's Learn Urdu ترتیب دیا ہے جو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ اس میں ص 101 پر حروف تہجی کی تعداد سینتیس دی گئی ہے۔ ایک لائن کے بعد نیچے نون غنہ اور دوچشمی ھ کا اندراج ہے جس کا مطلب یہ لیا جاسکتا ہے کہ یہ حروف تہجی میں شامل نہیں ہیں البتہ ہمزہ کا اندراج ہے۔

نیشنل کونسل آف ایجوکیشن ریسرچ اینڈ ٹریننگ یعنی NCERT نے پہلی جماعت کے طلبہ کے لیے ''ابتدائی اردو'' کے نام سے ایک کتاب 2006 میں شائع کی تھی۔ اس کتاب میں سبق 24 کے اندراج میں صفحہ 110 پر حروف تہجی تحریر کیے گئے ہیں ان کی کل تعداد چھتیس ہے۔ ان میں دوچشمی ھ اور ہمزہ کا اندراج نہیں ہے۔

رسالہ ''سبق اردو'' شمارہ 18 (اگست 2007) میں حیدرآباد کے معید جاوید کا ایک مضمون بعنوان ''حروف تہجی اور ان کی تفصیل'' شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں تحریر ہے:

''مخلوط حروف جو اردو صوتیات کے ضابطوں کے مقرر ہونے سے پہلے اردو حروف تہجی میں شمار نہ ہوتے تھے، اب اس میں شامل کر لیے گئے ہیں اس اعتبار سے اس وقت اردو کے حروف تہجی حسب ذیل ہیں۔''

ان میں اڑتیس حروف کے ساتھ ساتھ پندرہ ہکاری آوازیں بھی شامل کرلی گئی ہیں۔ اس طرح ان کی کل تعداد ترپن ہوجاتی ہے یہاں حروف تہجی میں ہمزہ اور دوچشمی ھ شامل ہیں۔

مدھیہ پردیش راجیہ شکشا کیندر بھوپال نے ''اردو بھارتی'' کے نام سے درجہ اوّل کے لیے نصابی کتاب شائع کی ہے اس میں حروف تہجی جو ص 42 پر دیے گئے ہیں ان کی تعداد اڑتیس ہے۔ ان میں ہمزہ اور دوچشمی ھ دونوں کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ''ہکاری آوازیں'' کے عنوان سے سولہ آوازوں کی فہرست الگ دی گئی ہے لیکن اس میں ہمزہ کی شکل عین کے سر یعنی (ء) خط ثلث کے بجائے خط رقاع یعنی (ء) کی شکل میں دی گئی ہے جو عام طور سے لکھائی میں استعمال ہوتی ہے۔

اب حروف تہجی کی تعداد میں اختلافی نوعیت صرف ہمزہ، دوچشمی ھ اور ہکاری یا بائیہ آوازوں کی رہ جاتی ہے۔ ہمزہ کے ذیل میں ماہنامہ ''اردو دنیا'' نئی دہلی کے ستمبر 2008 کے شمارے میں جناب انیس چشتی کا ایک مضمون بعنوان ''اردو زبان کی تدریس میں ہمزہ کا تعین'' شائع ہوا ہے۔ فاضل مضمون نگار نے اس مختصر مضمون میں ہمزہ کی اہمیت اور اس کی ضرورت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے اور ہمزہ کی جس طرح ''نسل کشی'' کی جارہی ہے اس کا ذکر کیا ہے۔

انیس چشتی نے ہمزہ کے ذیل میں اس کے استعمال کی سات صورتیں بتائی ہیں۔ (1) بے صوت ہمزہ (2) ہمزہ بحیثیت حرف علت (3) ہمزہ بحیثیت حرف وصل و ربط (4) ہمزہ بحیثیت معاون جزم و سکون (5) ہمزہ بحیثیت رمز (6) ہمزہ بحیثیت عشر اعشاریہ (7) ہمزہ کی دو شکلیں، خط ثلث میں عین کی سر کی طرح اور خطِ رقاع میں (ء) کی طرح اضافت، اعراب وصل، سکون جزم یا سکتے وغیرہ میں اس کی شکل خطِ رقاع کی ہوجاتی ہے۔

انیس چشتی نے آخر میں ہمزہ کی تدریس پر خصوصی زور دیا ہے۔ انھوں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ املا نویسی کی کسی کتاب میں نہ تو ہمزہ نویسی کے ان طریقوں یعنی اعشاریہ نظام اور ہمزہ کے دیگر استعمالات پر بحث کی گئی اور نہ ہی مذکورہ بالا دو طریقوں یعنی Character Forms کی نشاندہی کی گئی ہے۔

اردو میں ہائے ملفوظی، ہائے مختفی او رہائے مخلوط التلفظ، یہ تین قسمیں ہیں۔ پہلی دونوں قسمیں آج کل ہائے مدورہ سے لکھی جاتی ہیں لیکن ہائے مخلوط التلفظ کو جسے دوچشمی ھ بھی کہا جاتا ہے اس کا مائیت یا ہکاریت کے ذیل میں استعمال عام ہے اور اسے ہائے مخلوط کا بھی نام دیا گیا ہے۔

پروفیسر ابومحمد سحر نے ''دوچشمی ہے'' کے عنوان سے ایک تفصیلی مضمون ''اردو رسم الخط اور املا'' میں تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''انیسویں صدی کی ابتدا سے دوچشمی ہے کو ہائے مخلوط التلفظ، ہکاریت یا ہائیت کے لیے استعمال کرنے کا خیال پیدا ہو چکا تھا رفتہ رفتہ اس خیال نے تقویت حاصل کی اور اب ایک عرصے سے دوچشمی متفقہ طور پر ہائیت کی علامت تسلیم کی جاتی ہے اور بجائے خود ہائے مخلوط بھی کہلاتی ہے۔'' (ص43)

پروفیسر ابومحمد سحر کی اس معاملے میں حتمی رائے ہے کہ:

''اردو رسم الخط میں میں ہائیہ آوازیں دو حروف سے مل کر ظاہر ہوتی ہیں اصطلاحاً یہ مرکبات 'دوحرفی' Digraph ہیں۔ دوچشمی ہے صوتی اعتبار سے ہائے مدورہ ملفوظ کی دہری آواز ہے لیکن اپنے صوری امتیاز کی بنا پر مخصوص حروف سے مل کر ہا یہ دوحرفوں کو جنم دیتی ہے۔ اردو حروف تہجی میں دوچشمی ہے کا یہی اصل مصرف ہے۔''

(اردو رسم الخط اور املا ایک محاکمہ ''مضمون'' دوچشمی ہے'' ص 51)

اس موضوع پر شمس الرحمٰن فاروقی کی رائے سے بھی پروفیسر سحر کے موقف کی تائید ہوتی ہے وہ فرماتے ہیں:

''افسوس یہ ہے کہ ارباب لغت نے عقلی گدوں کا جو سلسلہ باندھا ہے اس میں..... حروف تہجی کو بھی جکڑ لیا ہے اور ایسے گل کھلائے ہیں کہ عقل دنگ اور ہوش گم ہو جاتے ہیں۔ سب سے پہلی زیادتی تو انھوں نے یہ کی کہ بزعم خود Phoneme کو حروف تہجی کا درجہ بخش دیا ہے لہٰذا ان کی فہرست کوئی دو ہاتھ لمبی ہوگئی ہے اور اس میں آ، رھ، ڑھ، نھ، مھ، شامل ہیں۔ خدا معلوم دوچشمی ھ کو کیوں چھوڑ دیا جس کے باعث ان مبینہ Phoneme میں سے اکثر کا وجود ممکن ہوا۔ اول تو ان سب آوازوں کا Phoneme ہونا ہی مشتبہ ہے لیکن اگر یہ ہیں بھی تو یہ کیوں ضروری ہے کہ..... مستقل حروف بھی قرار دے جائیں اور اس طرح حروف تہجی میں غیر ضروری اضافہ کیا جائے۔

حروف تہجی میں اضافے کی یہ کوشش نہ صرف قبیح اور غیر ضروری ہے بلکہ غیر فطری اور غیر سائنسی بھی ہے۔''

(''اردو لغات اور لغت نگاری'' شب خون 124، مارچ اپریل مئی 1982 ص 32,31)

ایک دوسری جگہ اپنی بات کا اعادہ کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی نے ماہنامہ ''اردو دنیا'' نئی دہلی کے ماہ اکتوبر 2007 کے شمارے میں ''اچھی اردو روزمرہ، محاورہ، صرف'' کے عنوان سے ایک قاری کے سوال کے جواب میں نہایت وضاحت سے تحریر کیا ہے کہ:

''بھ، پھ، تھ، وغیرہ ہندی کے حروف نہیں ہیں یہ سنسکرت کے حروف ہیں اور سنسکرت کے ذریعے ہندوستان کی کئی زبانوں میں رائج ہیں۔ ہر چند کہ بعض اردو ماہرین لسانیات نے بھ پھ تھ وغیرہ کو حروف تہجی کی فہرست میں شامل کرنا چاہا لیکن انھیں عام طور پر حروف تہجی نہیں بلکہ مخلوط آواز سمجھا جاتا ہے یعنی بھ میں ب اور ہ مخلوط ہے، تھ میں ت اور ہ مخلوط ہے۔ ڈھ میں ڈ اور ہ مخلوط ہے وغیرہ۔ قاعدۂ ابجد کی رو سے انھیں دو حروف مانا جاتا ہے۔''

ان مخلوط آوازوں کو حروف تہجی سمجھنے اور سمجھانے کی جو کوشش کی گئی ہے اور بعض لوگوں کی طرف سے اب بھی کی جا رہی ہے اس سے حروف تہجی کی گتھی سلجھنے کے بجائے اور الجھتی جا رہی ہے۔ ایک زبان جس کی دھوم سارے ہندوستان میں ہے ابھی تک اس کے حروف تہجی کا حتمی تعین نہیں ہو سکا ہے۔

پروفیسر ابومحمد سحر نے بازار میں دستیاب چودہ قاعدوں کا مطالعہ کیا، اسی کے ساتھ محمد صفدر آہ کی تکمیل ہجا، آئی پی ترکمان کا مرتبہ بالغوں کے لیے قاعدہ بھی دیکھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ:

''ان میں سے سات قاعدوں میں دوچشمی ہے حروف تہجی میں درج نہیں ہے..... دوچشمی ہے کہ ملواں شکلوں کے اندراج میں اس قدر انتشار ہے کہ نہ پوچھیے۔ یوں تو اکثر قاعدہ نگار اردو حروف تہجی کے تعین اور ہجے کے طریقۂ کار وغیرہ میں افسوسناک حد تک پریشان خیال کے شکار ہیں لیکن دوچشمی ہے کہ ملواں شکلیں تو ان کے لیے بلائے بے درماں بن گئی ہیں۔ ان کی (دوچشمی ہے کہ ملواں شکلیں) تعداد مقرر نہیں۔ کسی قاعدے میں دس، کسی میں گیارہ کسی میں بارہ، کسی میں تیرہ، کسی میں چودہ اور کسی میں پندرہ شکلیں دی گئی ہیں۔''

(اردو رسم الخط اور املا ایک محاکمہ ''مضمون'' دوچشمی ہے'' ص 50,49)

یہ بات پہلے بھی کہی جا چکی ہے اور اس کا یہاں دہرانا ضروری ہے کہ بعض حضرات نے اردو حروف تہجی کی ہندی حروف تہجی کے ساتھ مماثلت پیدا کرنے کی دھن میں اس بات کو نظر انداز کر دیا کہ ہندی میں بھی بعض ہکاری آوازیں دو حروف کا مجموعہ ہیں ان کے لیے بھی ایک حرف موجود نہیں ہے جیسے لھ، مھ، نھ اور رھ کے لیے کوئی مفرد حرف نہیں ہے۔

انگریزی زبان میں دو الفاظ کو جوڑ کر ایک آواز دیتے ہیں Digraph کہتے ہیں۔ مثلاً Ph, Ch, Sh, Dh, Kh وغیرہ انھیں ایک حرف نہیں کہا جاتا اور نہ ہی یہ حروف تہجی میں شامل ہیں۔ پھر اردو کے لیے ہی اصرار کیوں؟

حروف تہجی کی تعداد کا مسئلہ آج بھی انتشار کا شکار ہے اور حتمی طور پر اس کا

کوئی حل نہیں نکالا گیا ہے۔ مانا کہ اردو کی جمہوریت میں کوئی فیصلہ سب پر تھوپا نہیں جاسکتا لیکن یہ افراط وتفریط کب تک قائم رہے گی۔ اس سے اردو سیکھنے اور سکھانے والوں کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ اردو اساتذہ ہی کرسکتے ہیں۔

پروفیسر ابومحمد سحر نے اردو حروف تہجی کی تشکیل اور تعداد سے بحث کرتے ہوئے اس بات کو واضح الفاظ میں تحریر کیا ہے کہ اس انتشار کو دور ہوجانا چاہیے۔ انھوں نے حروف تہجی کی کل تعداد اڑتیس قرار دی ہے جو یہ ہیں:

اب پ ت ٹ ث ج چ ح خ

د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض

ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و

ہ ھ ء ی ے

''ان پر زور سفارش ہے کہ: ''اس تعداد (اڑتیس حروف) کو متفقہ طور پر قبول کرلیا جائے اور اس پر قاعدوں، قواعد کی کتابوں اور لغات وغیرہ میں پابندی سے عمل کیا جائے تو حروف تہجی کے بارے میں ذہنی انتشار دور ہوجائے گا، ان کی تعداد متعین ہوجائے گی...... اس سے نہ صرف اردو حروف تہجی کو استحکام حاصل ہوگا بلکہ اہل اردو میں حروف شناسی کی منزل بھی، جو خیر سے رسم الخط سیکھنے اور سکھانے کی پہلی منزل ہے ضروری اعتماد کے ساتھ طے ہوجائے گی۔''

(اردو ''رسم الخط اور املا ایک محاکمہ'' مکتبۂ ادب بھوپال ص 42)

میری ناقص رائے میں اس معاملے میں مزید تاخیر اردو زبان کی ترقی کے لیے مضر ہوگی۔

□□□

پتہ:
D-62, BDA Colony,
Koh-e-Fiza,
Bhopal

عبدالحلیم شرر — بحیثیت ناول نگار

مصنف: علی احمد فاطمی

اس کتاب میں مصنف نے عبدالحلیم شرر کے ناولوں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ موصوف نے شرر سے قبل کی سیاسی، سماجی اور ادبی صورت حال کے جائزے میں شرر کے حالات زندگی، خاندانی پس منظر، ملازمتوں اور علمی مشاغل، سفر انگلستان اور قیام حیدرآباد نیز ان کی بعض اہم تحریروں کی اولین اشاعت جیسے امور سے تفصیلی بحث کی ہے۔

صفحات: 393، قیمت -/165 روپے

غزل اور غزل کی تعلیم

مصنف: اختر انصاری

اختر انصاری کی یہ کتاب غزل کی تعلیم کے دوران پیش آنے والے مسائل سے بحث کرتی ہے جس میں اردو غزل کے تاریخی وادبی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو غزل کی ہیئت ومقبولیت، اس کے فنی محاسن، غزل کی تنقید اور بتدریج ارتقائی سفر کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بہ طور خاص درس وتدریس سے وابستہ افراد کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔

صفحات: 231، قیمت -/66 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

ابوالکلام قاسمی

ادبی صحافت اور ہمارے ادبی رویے

زبان کے تخلیقی کردار کے سبب ادب، اور ترسیلی کردار کے باعث صحافت کے مقاصد اور طریق کار کچھ اتنے مختلف تصور کیے جاتے ہیں کہ دونوں میں اشتراک کی تلاش اس حد تک محدود ہے کہ ادب اور صحافت، دونوں میں اپنے مدعا اور مافی الضمیر کا اظہار بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ تاہم صحافت کی بنیادی صفت چونکہ میقات کی پابندی ہے۔ اس لیے میقاتی یا Periodical ہونے کی صفت روزناموں، ہفتہ وار اخبارات اور ماہناموں یا سہ ماہی یا ششماہی کی صورت میں شائع ہونے والے رسالوں میں ہوتی ہے۔ اس وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ صحافت معلومات کی فراہمی اور اطلاعات کی ترسیل سے علاقہ رکھتی ہے اور ادب میں زبان کے استعمال کی نوعیت بڑی حد تک بالواسطہ اظہار کی ہوجاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اخبارات کی خبروں یا فیچر کے وسیلے سے کسی خیال، نقطۂ نظر یا معلومات کو جیسے ہی قاری تک پہنچا دیا جاتا ہے، وسیلۂ اظہار کی حیثیت سے زبان کا کردار ختم ہوجاتا ہے۔ جب کہ ادبی اظہار میں ترسیلِ خیال کا عمل اپنے آپ میں زبان کی کارکردگی کا محض آغاز بن پاتا ہے۔ ادبی زبان کی ترسیل قاری، پس منظر، صورت حال اور زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اپنے کردار کو ہمہ جہت بناتی ہے۔

زبان کے کردار کے اس اختلاف کے باوجود، ادبی جریدے اپنی میقاتیت کے سبب صحافت کا حصہ کہلاتے ہیں اور ان میں تخلیقی نوعیت کی شعری اور نثری تحریروں کی اشاعت کے باعث انھیں ادبی صحافت کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔ اب رہے ایسے مسائل جو اخبارات اور ادبی جرائد سے یکساں طور پر تعلق رکھتے ہیں، مثلاً اشاعت اور طباعت کا اہتمام قاری کی تلاش وجستجو وغیرہ تو ان معاملات کو اس مضمون میں اس لیے شامل نہیں کیا جائے گا کہ ان کی نوعیت کاروباری اور انتظامی ہے، اور یہ ایسے مسائل ہیں جو صحافت سے متعلق مسائل کے ہر جائزے میں زیر بحث لائے جاتے ہیں۔

بعض اخبارات اپنے ہفتہ وار ادبی ضمیمے بھی شائع کرتے ہیں، مگر یہ ضمیمے چونکہ اخبارات کا مفصل حصہ نہیں ہوتے، اس لیے اس نوع کی تحریروں کے سبب روزناموں یا دوسرے میقاتی اخبارات کو ادبی صحافت کے زمرے میں شامل نہیں کیا جاتا۔ اس کے برخلاف ادبی جرائد ورسائل میں جس طرح اداریہ، ادبی منظرنامے کو پیش کرتا ہے، خطوط میں جس طرح بعض مباحث کو آگے بڑھایا جاتا ہے اور بعض تحریری بحثوں میں ادبی رویوں کا معاصر تناظر سامنے لایا جاتا ہے، اس نوعیت کے صفحات اور کالم، اور مخصوص گوشوں کو اصطلاحی معنوں میں ادبی صحافت کا حصہ تصور کیا جانا چاہیے، اس لیے کہ اس نوع کے مباحث اور رایسی تحریریں اپنے زمانے کی متحرک ادبی فکر اور ادبی میلانات کے سیاق وسباق کے تعین میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

ادبی صحافت کے حوالے سے جب بھی کسی ادبی جریدے کو زیر بحث لایا جاتا ہے تو مدیر یا ادارے کے واضح یا غیر واضح ادبی موقف کو معمولات کا حصہ سمجھا جاتا ہے اور بالعموم اسے موضوع بحث نہیں بنایا جاتا۔ لیکن اگر کسی ادبی رسالے کی تحریریں اپنے معیار کو نظر انداز کرنے لگتی ہیں، تحریروں کی اشاعت میں سخت انتخاب کا عمل نمایاں نظر نہیں آتا اور رطب ویابس کی شمولیت جریدے کے سابقہ مزاج ومعیار کو متاثر کرنے لگتی ہے تو ادارے کا کردار سوالات کی زد میں آجاتا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ادبی جریدے کی اشاعت محض حاصل شدہ اچھے برے مواد، اور تخلیقات کی ترتیب نہیں ہوتی۔ اس ترتیب کے پیچھے انتخاب کا ایسا عمل کارفرما ہوتا ہے جن میں مدیر کی سوجھ بوجھ، اس کا ادبی مذاق، زبان کی نزاکتوں سے واقفیت، اور مناسب ترین اڈیٹنگ، جیسی تمام ذمے داریاں شامل ہوتی ہیں۔ ایک ادبی رسالے کا مدیر نہ صرف قابل اشاعت تحریروں کا انتخاب کرتا ہے بلکہ زبان وبیان اور الفاظ کے دروبست پر بھی نگاہ رکھتا ہے، وقت ضرورت ادارتی مداخلت سے کام لیتا ہے، تحریروں کو اصلاح اور تبدیلی سے گزارتا ہے، اپنے جریدے کے مزاج کی جھلک ہر چھپنے والی تحریر میں دکھانے کی کوشش کرتا ہے اور مجموعی طور پر اپنے جریدے کو ایک ایسی پیش کش میں تبدیل کردیتا ہے جو خود مدیر یا ادارے کے مزاج اور مثالی تصور کی نمائندگی کرسکے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رسالہ صرف مدیر کے مزاج اور مذاق کا عکاس نہیں ہوتا بلکہ ان پالیسیوں کی نمائندگی کرتا ہے جو تسلسل کے ساتھ اس مخصوص جریدے کا لازمہ تصور کی جاتی رہی ہیں۔ جریدے کے اس مزاج کی تشکیل میں ادارے کی ان تحریروں کا بھی حصہ ہوتا ہے جو اداریے یا دوسرے نوٹس کی شکل میں جریدے کے کردار کا تعین کرتی ہیں، بلکہ تشکیل پانے والے ادبی موقف کو مزید تقویت ان تحریروں اور مباحث سے ملتی ہے جو امتداد وقت کے ساتھ جریدے کے کردار کی صورت گری کرتے ہیں۔ ادبی جرائد کی تاریخ میں بعض ادبی رویے عام مضامین میں ظاہر ہوتے رہے ہیں اور بیش تر ادبی بحثوں نے جریدے کے رول کو نمایاں کیا ہے۔ ان بحثوں کی نوعیت مختلف جرائد میں مختلف ہوسکتی ہے۔ کبھی کسی بحث کا آغاز اداریے میں بیان کیے جانے والی تخلیقات بعض مباحث کو مہمیز کرتی ہیں اور بسااوقات قاری کے خطوط ادبی مباحث کو ایک خاص رخ دے دیتے ہیں مگر بحث وتمحیص کے اس پورے عمل میں ادارہ صرف تماشائی کا رول ادا نہیں کرتا، اس کا اپنا زاویہ نظر، اگر جریدے

کے صفحات میں سامنے نہیں آتا تو اکثر ادبی مباحث لاسمتی کا شکار ہوکر رہ جاتے ہیں۔ مدیر کی ذمے داری ہے کہ وہ جریدے میں اٹھنے والے مباحث کو کوئی نہ کوئی رخ ضرور دے، بحث کے اسلوب کو متوازن رکھے، توازن کے امکان کی مزاحمت کرے اور اداریے یا ادارتی نوٹ کے ذریعے ادارے کے نقطۂ نظر کو سامنے لائے۔ وزیر آغا نے عرصے تک ''اوراق'' میں ''سوال یہ ہے'' کا عنوان قائم کر کے نثری نظم اور ادب میں راہ پانے والے جمود پر مباحث کا بازار گرم رکھا۔ ''الفاظ''، ''افکار'' اور ''تحریک'' میں ترقی پسندی، جدیدیت اور نئے شعری اسالیب سے متعلق بحث میں کئی کئی شماروں میں نمائندہ ادیبوں نے شرکت کی، ''شب خون'' کے ابتدائی برسوں میں محمد حسن عسکری، وحید اختر اور محمود ہاشمی کے مضامین پر گفتگو کا سلسلہ چلا۔ ''صبا''، ''سطور'' اور ''ایوانِ اردو'' میں بھی کئی مباحث چھڑے جن میں ان رسائل کے مدیروں نے بحث کو اکثر کوئی نہ کوئی رخ دینے کی کوشش کی۔ مگر آزادی کے بعد شائع ہونے والے جرائد میں اس ضمن میں سب سے نمایاں کردار ''سوغات'' (بنگلور) کا رہا۔ ''سوغات'' کا ہر شمارہ محمود ایاز کی چھاپ لیے ہوتا تھا۔ ان کی پسند و ناپسند، ان کے ادبی تحفظات بلکہ تعصبات اور ان کا علمی و ادبی موقف، ساری چیزیں سوغات کے ہر شمارے سے جھلکتی تھیں۔ پھر یہ کہ محمود ایاز اپنے اداریے میں جریدے کے مشمولات پر اپنی رائے بھی ضرور ظاہر کیا کرتے تھے۔ خوبیاں تو خوبیاں، نقائص تک کی نشاندہی میں ان کو کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا، مختلف مسائل پر خطوط لکھ لکھ کر ردِ عمل حاصل کرتے اور اسے شائع کیا کرتے تھے، اور اردو ادب میں نو ساختہ اور نوزائیدہ بتوں کی شکست و ریخت میں بھی وہ غیر معمولی دلچسپی لیا کرتے تھے۔

شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ ادبی جرائد، ادبی صحافت میں کوئی بھرپور کردار ادا نہیں کرتے جن میں مدیر اپنے موقف اور اپنے ادبی مسلک کے ساتھ ہر صفحے پر اپنی موجودگی کا احساس نہیں دلاتا۔ ادارتی موجودگی کا یہی عمل جریدے کے کردار کا تعین کرتا ہے اور رسالے کو اپنے عہد کے ادبی مزاج، صورت حال اور رفتار کا آئینہ بناتا ہے۔

ادبی صحافت اس اعتبار سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہوتی ہے کہ ادبی صحافت کی نمائندگی کرنے والا رسالہ سیال ادبی رویّوں اور رجحانات کا عکاس ہوتا ہے۔ رسالے کے برخلاف کتابوں میں شائع ہونے والی تحریریں بالعموم ادبی روایت سازی کا حصہ ہوتی ہیں۔ ان تحریروں میں ادبی رویے جب تک استحکام سے ہم کنار نہ ہوں کتاب سنجیدہ ادبی روایت کا حصہ نہیں بن پاتی۔ جب کہ ادبی صحافت ادبی مسلمات کے بجائے بہت سے ادبی اور فکری مفروضات اور منتشر ادبی ارتقاشات کو بھی اپنی گرفت میں لینے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتی۔ یہی سبب ہے کہ کسی بھی زمانے کے ادبی مباحث کا سب سے معتبر او رمناسب ترین ریکارڈ رسائل کی فائلوں میں موجود ہوتا ہے۔ ماضی کے رسائل میں علمی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی نوعیت کی ایسی تحریریں محفوظ ہیں جن کی بازیافت کر کے ادب کی سمت و رفتار اور قابلِ اعتبار تاریخی شواہد کو بہ آسانی عام قاری کے لیے سہل الحصول بنایا جاسکتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ادبی مباحث کا بڑا حصہ کتابوں کے صفحات تک نہیں پہنچ پاتا، اس لیے ادبی صحافت کو ہی ادبی میلانات کی تاریخ کا معتبر ترین وسیلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ادبی جرائد کا زمانی حوالہ اور میقاتی سیاق و سباق، ادبی صحافت کو صحافت کے عام تصور کے برخلاف زیادہ دیرپا بنا دیتا ہے۔ اردو میں ہی کیا انگریزی اور دوسری بڑی زبانوں میں بھی اس بات کا اہتمام نہیں کیا جاتا کہ کسی زمانی حد کا تعین کر کے اس زمانے کی ادبی بحثوں کا ریکارڈ تیار کیا جاتا اور انھیں ادب کے مورخین کے لیے حوالے کی دستاویز کے طور پر شائع کیا جاتا۔ اس نوع کی کوششیں سائنس اور سماجی علوم سے متعلق رسائل و جرائد اور ان کے ادارے ایسا کرنے لگے ہیں، مگر اردو کی ادبی صحافت سے اس نوع کے استفادے کی راہ ہنوز آسان نہیں معلوم ہوتی۔ تاہم ادبی جرائد کے اس کردار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی فائلوں کے ذریعے ان کی افادیت کو دوررس اور زیادہ کارآمد بنایا جاسکتا ہے۔ ادبی جرائد کی فائلوں کی مدد سے ادب کی تاریخ کے تسلسل کو زیادہ معتبر اور زیادہ قابلِ وثوق انداز میں سمجھا بھی جاسکتا ہے اور علمی اور ادبی تحقیق کا وسیلہ بھی بنایا جاسکتا ہے۔

ادبی جرائد کے صفحات میں جس نوع کے مضامین محفوظ ہوتے ہیں ان کا ایک بڑا حصہ کسی نہ کسی صورت میں کتابوں کے صفحات میں محفوظ ہوکر زیادہ سہل الحصول اور کارآمد ہو جاتا ہے، تاہم ایسی تحریریں بھی کم تعداد میں نہیں ہوتیں جن کو کتابوں تک رسائی حاصل کرنے کا موقع ہی نہیں مل پاتا۔ اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ادبی جرائد کی ان گنت تحریریں وقتی اور زمانی سیاق و سباق کی وجہ سے مستحکم ادبی روایت کا حصہ ہی نہیں بن پاتیں اور کتابوں میں ان کی شمولیت تقریباً خارج از امکان ہوتی ہے۔ مگر اس نوع کی تحریریں بھی تاریخ کے تسلسل کو سمجھنے اور کتابوں کی اشاعت کے درمیان کے وقفوں سے واقفیت کے نقطۂ نظر سے بڑی اہم ہوجایا کرتی ہیں۔ ادبی صحافت، اسی باعث ادبی رویے اور میلانات کا ایسا ریکارڈ تیار کرتی ہے جس میں رطب کے ساتھ یابس اور اہم کے ساتھ غیر اہم بھی قابلِ اعتنا بن جاتا ہے۔ اس لیے ادبی صحافت میں محفوظ کڑیوں کو جوڑ کر ادب کی تاریخ کے نشیب و فراز کو زیادہ وسیع تناظر میں دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔

ادبی جرائد میں چونکہ اشاعت کے تواتر کے باعث زمانی تسلسل بھی قائم ہوتا ہے اور ان میں شائع ہونے والی شعری اور نثری تحریروں پر خطوط کے کالم میں ردِ عمل کی اشاعت بھی عمل میں آتی رہتی ہے، اس لیے رطب و یابس کا تعین اور کھرے کھوٹے کی پرکھ کا عمدہ پیمانہ بھی ادبی جرائد کے صفحات میں ہی محفوظ ہوتا ہے۔ ادبی جرائد میں معاصر ادب کی پرکھ اور تعین قدر کا دوسرا بڑا پیمانہ وہ صفحات ہوتے ہیں جن میں تازہ ترین مطبوعات پر تبصرہ شائع کیے جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ماضی کے اہم جرائد ادبی دنیا، ساقی، نیرنگ خیال،

ادب لطیف اور نگار وغیرہ کی ادبی پرکھ اور تبصرہ میں معروضی نقطۂ نظر کا عشر عشیر بھی آج کے رسالوں میں شائع ہونے والے تبصروں میں دیکھنے کو نہیں ملتا، مگر اس کے باوجود ایک ایک کتاب پر مختلف جرائد میں شائع ہونے والے تبصرے اور ہر مبصر کا مختلف اور منفرد نقطۂ نظر بیش تر کتابوں کی صحیح قدر و قیمت کو ضرور ظاہر کر دیتا ہے۔ ادبی صحافت کی غیر موجودگی میں نئی مطبوعات کی وقعت اور اصلیت کا پورا اندازہ لگا لینا آسان نہیں ہوتا۔

ادبی جرائد میں نثری تحریریں بھی شائع ہوتی ہیں اور شعری تخلیقات بھی۔ کتابوں اور جریدوں کے فروغ سے قبل شاعری کی ترسیل کا سب سے بڑا وسیلہ مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ مگر مشاعروں میں شاعری سننے، داد و تحسین سے نوازنے یا سکوت اختیار کرنے جیسے رویوں کی مدد سے اس شاعری کی معنویت اور قدر و قیمت کو قرار واقعی انداز میں سمجھنا تقریباً ناممکن تھا۔ مشاعروں میں شاعر کی ساری مقبولیت سماعی اور عارضی ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف ادبی جرائد میں شاعری کی اشاعت نہ صرف شعری متن کے سنجیدہ مطالعے کا موقع فراہم کرتی ہے بلکہ شاعری کے محاسن و معائب پر غور و خوض کا موقع بھی دیتی ہے۔ خطوط کا کالم میں اظہار خیال کی گنجائش اور مختلف شعری تخلیقات کی اشاعت کے سبب تقابلی تناظر بھی جرائد کے صفحات میں موجود ہوتا ہے۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ادبی جرائد میں احتساب اور تعین قدر کے امکان نے مشاعروں کے معیار میں بھی اضافہ کیا اور مشاعروں میں محض سماعی شاعر ہونے سے زیادہ سنجیدہ رسالوں میں شائع ہو کر اعتبار حاصل کرنے کے رجحان میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

ادبی صحافت کی اصطلاح اپنے آپ میں خواہ قدرے تضاد پر مبنی کیوں نہ ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ ادب کا یہی صحافیانہ کردار اسے خالص علمی اور تکنیکی نوعیت کی تحریروں سے مختلف اور ممتاز بنائے رکھتا ہے۔ عام صحافت کی طرح ادبی صحافت میں بھی اس نوع کی دلچسپی یا محدود انداز کی سنسنی خیزی سے اجتناب ممکن نہیں ہوتا جو جریدے میں قاری کی کشش کو قائم رکھنے، ہر نئے شمارے کا انتظار کرانے، وارد ہونے والے اعتراضات اور جوابات یا جواب الجواب سے پیدا ہونے والی کشمکش کی فضا پیدا کرنے کے محرکات کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ادبی جرائد کی ایک افادیت یہ بھی ہے کہ یہ جرائد عام پڑھنے والوں میں بھی لکھنے کی تحریک پیدا کرتے ہیں اور شعر و ادب میں دلچسپی پیدا کرنے کا بہترین وسیلہ بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ادبی تحریروں کو جب تک استناد حاصل نہیں ہوتا، کتابوں کی صورت میں ان کی اشاعت مشکل سے ہی عمل میں آتی ہے، یا ناپختہ کار ادیبوں کی جو مبتدیانہ کتابیں شائع ہوتی ہیں وہ اپنا اعتبار قائم نہیں کر پاتیں۔ کتابوں کے برخلاف ادبی جرائد میں شائع ہونے والی تحریریں مشق سخن یا مشق ادب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہر نیا لکھنے والا اپنی ابتدائی تحریروں کو جرائد میں شائع کرانے کا نہ صرف مستحق سمجھا جاتا ہے بلکہ رسائل و جرائد کے صفحات پر شائع ہونے والی تحریریں ہی مشق و مزاولت کا آغاز بھی ہوتی ہیں اور ان تحریروں سے ہی نو واردان بساط ادب کو اعتبار بھی حاصل ہونا شروع ہوتا ہے۔ ادبی جرائد کے اس رول کے سبب ادبی صحافت ہر زمانے کی نئی نسل کی تربیت بھی کرتی ہے، اس کو معاصر رجحانات سے باخبر رکھتی ہے، کھرے کھوٹے کی پرکھ میں معاون ثابت ہوتی ہے اور رطب و یابس تحریروں کے انبار میں ممتاز اور نمائندہ ادب پاروں کی پہچان کا سلیقہ سکھلاتی ہے۔ کتابی صورت میں شائع ہونے والی تحریروں کی پرکھ یا تو تبصروں کے ذریعے ممکن ہوتی ہے یا پھر قاری کی قوت ممیزہ پر اس کا دارومدار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر قاری تربیت یافتہ ادبی پارکھ نہیں ہوتا جب کہ کتابوں کے برخلاف ادبی جرائد میں شائع ہونے والی تحریروں کی حیثیت چونکہ رجحان سازی میں معاون تحریروں کی ہوتی ہے او ربالعموم ان تحریروں کے معتبر اور مستند ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کیا جاتا، اس لیے ادبی صحافت کی صورت میں جو ادب پارے منظر عام پر آتے ہیں وہ قاری کو ردعمل پر بھی اکساتے ہیں اور تعین قدر کی عام دعوت کے مترادف بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے ادبی جرائد سے وابستہ رہنے والا عام قاری بھی ادبی تربیت اور اپنے معروضی نقطۂ نظر کے اظہار کے عمل سے گزرتا ہے اور پوری ادبی صورت حال میں اپنے آپ کو شریک بھی محسوس کرتا ہے۔

ادبی جرائد کے وسیلے سے قاری کی تربیت کا عمل ایک استمراری عمل ہوتا ہے جو ہر زمانے میں جاری رہتا ہے۔ اس تربیت کے عمل کا دوسرا رخ یہ بھی ہوتا ہے کہ ادبی جرائد نئے موضوعات پر لکھنے کی طرف مائل کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو جریدے کا تنوع قائم نہیں رہ سکتا، قاری کے ذوق مطالعہ کو مہمیز کرنا بھی کسی جریدے کی اہم ذمے داری ہوتی ہے۔ اس عمل میں وہ جرائد بھی شریک ہوتے ہیں جو کسی مخصوص ادبی رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں اور وہ رسائل بھی جو غیر جانب دارانہ انداز میں ادب کے فروغ کو اپنا مشن تصور کرتے ہیں۔ ادبی صحافت میں کسی ادبی تحریک یا رجحان کی نمائندگی کرنا معیوب ہے اور نہ ہی ادبی غیر جانب داری یا معروضیت کو اپنا شعار بنانا۔ ان معروضات کی بنیاد بیش تر وہ عملی اور براہ راست تجربہ ہے جس سے راقم الحروف بحیثیت مدیر اور بحیثیت قاری کے گزرتا رہا ہے۔ کہنے کو تحقیقی یا خالص علمی نوعیت کے جرائد بھی ادبی صحافت کے زمرے میں آتے ہیں مگر ان کا حلقۂ اثر محدود ہوتا ہے اور یہی تحدید ان کو عام قاری کی ادبی یا علمی شمولیت اور ابتدائی انداز کی قاری کی ادبی اور فنی تربیت سے دور رکھتی ہے۔ اس نوع کے کسی بھی مخصوص علمی یا ادبی پہلو کی نمائندگی کرنے والے جرائد کے مسائل قدرے مختلف ہوتے ہیں۔ جن کی تفصیل میں جانا زیر بحث موضوع کے دائرۂ کار سے باہر کی چیز ہے۔

□□□

پتہ:
Deptt of Urdu, Art Faculty,
AMU, Aligarh-202002

کے. وی. نکولن

تمل ناڈو کی اہل قلم خواتین

دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہر چھوٹی بڑی تحریک کے پس منظر میں صنف نازک کا دست عمل کارفرما نظر آتا ہے۔ بظاہر وہ منظر عام پر نہیں آتی لیکن ہر تحریک میں اس کا اثر جاری وساری ہے۔ یوں تو زندگی کا کوئی شعبہ کوئی پہلو ایسا نہیں جس میں عورت کا دخل نہ رہا ہو۔لیکن ادب اس کا خاص قلمرو ہے۔

ہر قوم کے ادب میں خواتین کی فکر ونظر کے مظاہروں کا کافی ذخیرہ موجود ہے یہ بات اور ہے کہ اولاد آدم نے حوا کی بیٹیوں کی ان کاوشوں کو عام طور پر قابل اعتنا نہیں سمجھا لیکن آج اکیسویں صدی میں جب فکر انسانی ارتقا کے منازل طے کر رہی ہے خواتین کے ادبی کارناموں کو بہ نظر استحسان دیکھا جارہا ہے۔ ہندوستان میں صنف نازک سے تغافل پرانی روایت ہے۔ ہندوستانی مردوں نے زندگی کے ہر شعبے میں اسے پس پشت ڈالا اور اس کی ذہنی ترقی میں رکاوٹیں ڈالیں۔ چنانچہ اردو ادب میں بھی خواتین کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ادب کی تاریخ میں اہل قلم خواتین کی نمائندگی تناسب کے اعتبار سے اتنی نہیں ہو پائی جتنی ہونی چاہیے تھی۔ اردو کے ابتدائی زمانے سے ہی خواتین کو ادب سے دلچسپی رہی ہے۔ عہد حاضر میں قومی سطح پر ہی نہیں صوبائی سطح پر بھی خواتین کی ادبی دلچسپیاں کچھ زیادہ ہی ابھر کر سامنے آئی ہیں۔

ریاست تملناڈو میں اردو شعر وادب کی روایت بہت پرانی ہے یہاں میر مومن کے دور ہی سے علم و ادب کی طرف پیش قدمی شروع ہوگئی تھی۔ مدراس، وانمباڑی، آمبور، آرکاٹ، میل وشارم، کرشنا گری، ترپاتور اور ترچناپلی صوبۂ تملناڈو کے وہ ادب پرور شہر ہیں جنھیں اردو شعر وادب کے فروغ واشاعت میں مرکزیت حاصل رہی ہے۔ ان شہروں نے جہاں باصلاحیت شعرا کو جنم دیا وہاں باصلاحیت اہل قلم خواتین اور شاعرات سے بھی ان کا دامن خالی نہیں ہے۔ یہاں کی اہل قلم خواتین کی نگارشات، اردو ادب کا وہ سرمایہ ہیں جس کے بغیر تمل ناڈو کی ادبی تاریخ مکمل نہیں سمجھی جائے گی۔

صوبۂ تملناڈو میں اردو ادب کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ اس خطۂ زمین پر اردو ادب میں اول اول خواتین کی ذہنی پرداخت اور انھیں شعر وادب کی طرف رغبت دلانے والی شخصیات میں مولانا باقر آگاہ ویلوری کے علاوہ قاضی بدرالدولہ کا نام اور کام ہمیشہ روشن رہے گا۔ ان کے بعد اس سلسلے کو آگے بڑھانے والوں میں خاندان نوائط کے ارباب علم وفن پیش پیش رہے ہیں۔ بالخصوص نوابین آرکاٹ کے دور میں اہل نائط نے خواتین کو تحصیل علم کی طرف مائل کرنے میں بھرپور کامیابی حاصل کی۔

انیسویں صدی میں خانوادۂ قاضی بدرالدولہ کی اہل قلم خواتین میں آمنہ بی، حسینہ بی، امتہ العزیز، نعیمہ بیگم کے علاوہ والا جاہی خاندان کی خواتین میں خدیجہ ضیا، امتہ الرحمن، الفت النساء الفت، حبیب النسا، مہر النساء، اشمہ آرکاٹی، خاتون بی بی عاجزہ اور بیسویں صدی کے نصف اول اور آخری دہوں میں حسنیٰ بیگم، صبا مصطفےٰ، ڈاکٹر پروین فاطمہ، منور رشید، ذاکرہ ام شہلا اور جاویدہ حبیب کی خدمات کا اعتراف کرنا ضروری ہے۔ اشمہ آرکاٹی، نواب مبشر النساء حیا اور حجاب امتیاز علی تاج نے شعر وادب کی تمام اصناف میں اپنے یادگار نقوش چھوڑے ہیں۔ ان اہل قلم خواتین میں شاعرات بھی ہیں، افسانہ نگار بھی ہیں ناول نگار بھی ہیں اور محقق بھی۔ محققین میں ڈاکٹر ذاکرہ غوث، ڈاکٹر پروین فاطمہ اور ڈاکٹر ذاکرہ ام شہلا کو بلند مرتبہ حاصل ہے۔ مولانا باقر آگاہ، حضرت قربی ویلوری اور والا جاہی خاندان کے شاعر رؤف احمد خان پرتو، عبدالرحمن خان شاطر، تجمل حسین خان ایمان گوپاموی پر ان اہل قلم خواتین کے تحقیقی اور تنقیدی مقالے زیور طبع سے آراستہ ہوچکے ہیں۔

آرکاٹ کی باکمال اہل قلم خواتین میں اشمہ آرکاٹی کا شمار ہوتا ہے۔ ایک نثر نگار خاتون کی حیثیت سے بھی اشمہ آرکاٹی نے اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا ہے۔ اشمہ آرکاٹی تملناڈو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ ہے۔ اشمہ کی تاریخ ولادت اور وفات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاہم عام رائے کے مطابق اشمہ کی پیدائش 1825 میں ہوئی اور وہ 1877 تک بقید حیات رہیں کیونکہ ان کی آخری تصنیف ''گلشن شاہداں'' اسی سنہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔

اشمہ نواب والا جاہ کی نواسی تھیں۔ اشمہ کا ذکر سب سے پہلے ہمیں سخاوت مرزا کے ایک مضمون ''اشمہ۔ مدراس کی ایک جید شاعرہ'' میں ملتا ہے جو 1952 میں ''نوائے ادب'' میں شائع ہوا تھا۔ اشمہ کا خاص میدان سخن مثنوی ہے۔ اشمہ نے پانچ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔

1. مثنوی گلبن مہ رخان
2. مثنوی مہوشاں
3. مثنوی گلشن شاہداں
4. گلشن عاشقاں

5. اردو دیوان

ان تصانیف میں گلشن عاشقاں نثر میں ہے اور باقی تمام تصانیف ان کی شعری تخلیقات ہیں۔ مثنوی گلبن مہ رخاں کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں بھی محفوظ ہے۔ یہ اہمہ کی پہلی شعری تصنیف ہے۔ تقریباً 1400 اشعار پر مشتمل اس مثنوی کے مطالعے سے آرکاٹ شہر کے محلات کی آرائش و زیبائش، نوائطہ عورتوں کی سلیقہ شعاری، مذہبی رسم و رواج کے علاوہ ان کے طور طریقے اور ملبوسات وغیرہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ مثنوی اپنے عہد کی سماجی اور تہذیبی زندگی کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔ مثنوی کے تین شعر ملاحظہ کیجیے:

چمن میں عجب حوض تھا پُر بہار
تھے فوارے پر جس کے موتی نثار
بچھا فرش اطلس کا تھا جا بجا
کہے تو کہ ہے چرخ اطلس نما
پڑا عکس جب ان کا سوئے چمن
گلوں کا مصفا بنا انجمن

اس مثنوی کے انداز بیان اور اس کی روانی پر کہیں کہیں میر حسن کی ''سحر البیان'' کا گمان ہوتا ہے۔ مثنوی کی بحر بھی وہی ہے۔

انیسویں صدی کی دوسری اہم شاعرہ نواب امتہ الغنی مبشرہ بیگم حیا ہیں۔ 1886 میں مدراس میں پیدا ہوئیں۔ مبشر النساء بیگم حیا غلام محمد علی خان پرنس آف آرکاٹ پنجم کی اہلیہ تھیں۔ حیا نے جس دور میں اپنی شاعری کا آغاز کیا تھا۔ اس وقت اقبال اور حسرت موہانی شاعری کے افق پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمک رہے تھے۔ حیا کے والد نواب تجمل حسین ایمان والا جاہی خاندان کے آخری نواب محمد غوث خان اعظم کے عہد کے ایک جید عالم اور شاعر تھے۔ مبشر النساء بیگم نے اپنا تخلص حیا اپنے والد کے تخلص ایمان کی مناسبت سے ''الحیاء من الایمان'' کا جز سمجھ کر اختیار کیا۔ قلمی نام کے انتخاب سے ہی اس خاندان میں علم کی قدر و قیمت اور جستجو کا پتہ چلتا ہے۔ حیا کی طبیعت چونکہ عشق رسول سے سرشار تھی اس لیے انھوں نے دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں نعت گوئی کو ترجیح دی اور آخری عمر تک نعت کہتی رہیں۔ حیا کے عشق میں اتنی صداقت تھی کہ ان کا انتقال 1961 میں مدینے میں ہوا اور وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی جیسی کہ ان کی خواہش تھی

جان اپنی کیجیے شہ پر نثار
چل کے روضے پر فدا ہوجایئے
یہ جان لو اسے مر کر ملی حیاتِ ابد
حیا کو دفن اگر شہ کے زیرِ بام کیا
جان ہوجائے مری پائے نبیؐ پر صدقے
خواب ہی میں نظر آجائے جو صورت ان کی

حیا نے ایک طویل نظم ''معراج نامہ'' بھی لکھی ہے جو ان کی قادر الکلامی پر دال ہے یہ نظم مسدس کی ہیئت میں ہے۔ کل سترہ بند ہیں۔ بطور نمونہ اس نظم کا ایک بند ملاحظہ کیجیے۔

پھر چلے سوئے افلاک خیر الوریٰ
شور یا ربی صلی علیٰ کا مچا
حور و غلماں ملک مرسل و انبیا
بہر نظارہ تھے آپ پر سب فدا
اپنی جانوں کو قربان کرنے لگے
پائے اقدس پہ سر اپنا دھرنے لگے

حیا کے کلام میں اسلوب کی سادگی، بیان کی سلاست و روانی، اور سب سے بڑھ کر عشق میں سرشاری کی کیفیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ حیا کے انتقال کے بعد ان کے بھائی محبوب پاشا محبوب نے ان کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ''نم خانۂ محامد'' کے نام سے ترتیب دے کر شائع کیا۔

بیسویں صدی کی اہل قلم خواتین میں حجاب امتیاز علی تاج کو نہ صرف تملناڈو بلکہ پوری اردو دنیا میں ایک معتبر اور اہل قلم خاتون کا درجہ حاصل ہے۔ حجاب کی پیدائش ضلع شمالی آرکاٹ کے شہر وانمباڑی میں 1907 میں ہوئی۔ ان کے والد مولوی محمد اسماعیل کا شمار اپنے وقت کی معروف شخصیات میں ہوتا تھا۔ شہر وانمباڑی کے اسلامی معاشرے میں رہ کر حجاب کو مشن اسکول میں تعلیم دلانا گویا اس دور کے ماحول کے ساتھ ایک طرح کی بغاوت تھی۔ لیکن یہاں تعلیم پانے کا فائدہ یہ ہوا کہ حجاب کو انگریزی تہذیب سے واقفیت حاصل ہوگئی۔ نیز اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر انھیں عبور حاصل ہوگیا۔ تعلیم سے فارغ ہوکر حجاب پائلٹ ہوگئیں۔ حجاب اس وقت تک پہلی مسلمان خاتون تھیں جنھوں نے یہ پیشہ اختیار کیا۔ حجاب کو حصول تعلیم کے زمانے ہی سے کہانیاں لکھنے کا شوق تھا۔ وہ اپنا یہ ذوق وانمباڑی سے نکلنے والے ادبی رسالوں ''منزل'' اور ''آشیاں'' میں کہانیاں چھپوا کر پورا کرتی تھیں۔ حجاب نے ناول بھی لکھے جو اردو ناول کی تاریخ میں اپنے مخصوص موضوعات اور اسلوب نگارش کے سبب بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ حجاب نے اپنے آخری ایام لاہور میں بسر کیے۔ وہاں بھی وہ اپنے قلم کی جولانیاں برابر دکھاتی رہیں۔ حجاب امتیاز کے قلم سے تخلیق پانے والے ناولوں میں سب سے پہلا ناول ہے رومانی جو ''ظالم محبت'' کے نام سے شائع ہوا۔ ان کی تخلیقات ''عالم گیر'' اور نیرنگ خیال'' لاہور میں برابر شائع ہوتی رہیں۔ حجاب بچوں کے لیے بھی بچوں کے رسالے ''پھول'' دلی

میں کچھ نہ کچھ لکھتی رہیں۔ اردو دنیا میں حجاب امتیاز کے جن افسانوں کو غیر معمولی شہرت نصیب ہوئی ان میں ''لاش'' ''صنوبر کے سائے'' میری ناتمام محبت'' اور'' موت کا راگ'' خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں تملناڈو کے ادبی افق پر بہت ساری اہل قلم خواتین نمودار ہوئیں جن میں امیر الضیاء، مہرطلعت آمبوری، ڈاکٹر پروین فاطمہ، ڈاکٹر ذاکرہ ام شہلا، عرفانہ تزئین شبنم اور جاویدہ حبیب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

صوبہ تملناڈو میں اردو کے افسانوی ادب کو پروان چڑھانے میں جن خواتین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں امیر الضیا کا نام سر فہرست آتا ہے۔ ان کی پیدائش 1950 میں بمقام گڈیاتم ضلع شمالی آرکاٹ، ایک مہذب اور متمول گھرانے میں ہوئی۔ اصل نام امیر النساء اور شوہر کا نام ضیاء الدین ہے شوہر کے نام کی مناسبت سے امیر الضیا کے قلمی نام سے لکھتی ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے ماہنامہ ''بتول'' اور ''بانو'' میں شائع ہوئے۔ امیر الضیا نے اپنے افسانوں میں متمول طبقے میں پائے جانے والے غلط تصورات اور بے جا رسم و رواج کی نشاں دہی کی ہے۔ وہ رفیعہ منظورالامین اور بشریٰ رحمٰن سے متاثر ہیں۔ ''چراغ تلے اندھیرا''، ''ثمر بار'' اور'' درد کا احساس'' ان کے نمائندہ افسانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کا پہلا ناول ''عنبرین'' کے نام سے 1980 میں شائع ہوا۔ انھوں نے اپنے ناول کو ایک خاص تعمیری رخ دینے کی کوشش کی ہے اور یہ کوشش بہت حد تک کامیاب ہے۔

امیر الضیا کے افسانوں کا مجموعہ ''بند کتاب'' 1998 میں شائع ہوا اس مجموعے میں شامل سبھی افسانے گھریلو ماحول، خواتین کی نفسیات اور طبقۂ نسواں کے مسائل پر مبنی ہیں۔ ان کا یہ مجموعہ تملناڈو کے ادبی سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہے۔

بیسویں صدی کے آخری دہے میں جن خواتین نے ہندوستان گیر شہرت حاصل کی ان میں مہرطلعت آمبوری کا بھی شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے ہندوستان بھر کے معیاری ادبی رسالوں میں جگہ پائی اور اپنا ایک مقام پیدا کیا۔ مہرطلعت 8دسمبر 1947 کو آمبور کے ایک غیر اردو داں گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ انھیں گھر کی چار دیواری میں صرف تمل زبان سے ہی واسطہ رہا۔ اردو ان کی اکتسابی زبان ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسے غیر اردو ماحول میں رہتے ہوئے بھی انھوں نے اردو سے اس قدر وابستگی کیسے پیدا کرلی؟ ان کے افسانوں نے سینکڑوں قارئین کے دلوں کو مسخر کیا ان میں ایک اکبر علی بھی تھے جو ہندوستانی فوج میں کپتان تھے۔ مہرطلعت کی تحریروں نے انھیں اس قدر متاثر کیا کہ انھوں نے آمبور آکر ان سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوجانے کی خواہش ظاہر کی۔ گھر والوں کی رضامندی سے 12 جنوری 1970 کو دونوں کا نکاح ہوگیا۔ بارہ سال خوش حال زندگی گزارنے کے بعد اکبر علی کا 1982 میں انتقال ہوگیا۔ مہرطلعت ان دنوں کشمیر میں اپنی سسرال میں رہتی ہیں۔

مہرطلعت نے دو تین ناول بھی لکھے ہیں جو طباعت کی منزل تک نہیں پہنچ سکے۔ وہ اپنی تحریروں میں عورتوں کے حقوق اور آزادیٔ نسواں کی حمایت کرتی ہیں۔ ''نازک رشتہ'' اسی موضوع پر لکھا گیا ایک کامیاب افسانہ ہے۔ اس افسانے میں مہرطلعت قاری کو مختلف نفسیاتی الجھنوں سے گزار کر یہ ثابت کرتی ہیں کہ عورت کے جذبات جس حقیقت کا ادراک کرسکتے ہیں۔ مرد کی شک بھری نگاہیں ان حقائق تک رسائی حاصل کرنے میں اکثر دھوکا کھا جاتی ہیں۔

مقالے کو طول نہ دیتے ہوئے میں بس یہ کہوں گا کہ پچھلے دس سال سے سرزمین تملناڈو میں زبان و ادب کے تعلق سے نئی نسل میں ایک بیداری کا احساس پیدا ہو چلا ہے۔ ان کا رجحان ناول، افسانہ اور غزل کی طرف زیادہ ہے۔ نئی نسل کے نوجوانوں میں کئی چہرے ایسے ابھرے ہیں جو مسلسل رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں خواتین کا حصہ نمایاں ہے۔ ڈاکٹر پروین فاطمہ، ڈاکٹر ذاکرہ ام شہلا، ڈاکٹر جاویدہ حبیب، عرفانہ تزئین شبنم، منور رشید، نگار سلطانہ جلیلی اور ساجدہ زرین کے قلم کی جولانیوں سے تملناڈو میں اردو زبان و ادب کی رفتار تیز سے تیز تر ہونے کے امکانات روشن ہیں۔

کتابیات

1. تملناڈو میں اردو غزل، ڈاکٹر آصفیہ شاکر، مطبوعہ جنوری 2008، مدراس
2. والا جاہی خاندان کے تین شاعر، پرتو، شاطر اور ایمان مطبوعہ 1987، ڈاکٹر پروین فاطمہ
3. تملناڈو میں اردو، علیم صبا نویدی، مطبوعہ 1997
4. ملیالم ادب کی تاریخ، ڈاکٹر سید سجاد حسین، مطبوعہ 1994، دلی
5. آثار و افکار، ڈاکٹر سید سجاد حسین، مطبوعہ 1992، مدراس
6. تملناڈو میں اردو نثر کا ارتقا، آزادی کے بعد، ڈاکٹر احمد باشاہ، مطبوعہ 2000
7. شمالی آرکاٹ میں اردو، ڈاکٹر جاویدہ حبیب، مطبوعہ 2005، مدراس
8. تاریخ نثر اردو، تملناڈو میں، ڈاکٹر سید صفی اللہ، مطبوعہ مارچ 2008، مدراس

□□□

پتہ:
Senior Lecturer, Deptt. of Urdu,
Sir Sankara Charia University of Sanskrit,
Regional Centre, Kayalandy-673330

ضیاء الرحمٰن صدیقی

آثار الصنادید۔ آثاریات پر ایک اہم دستاویز

ایرانی شاعر خاقانی کا مشہور شعر ہے

از نقش و نگار درودیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

یہ شعر خاقانی کے قصیدے ''ایوان مدائن'' میں شامل ہے۔ مدائن قدیم ایرانی سلطنت کا پایۂ تخت تھا اس کے کھنڈرات نے خاقانی کی وطن دوستی کے جذبے کو مہمیز دی اور اس نے ایک تباہ حال شہر کی سرگذشت کے پردے میں ایک پوری تہذیب کا مرثیہ لکھ ڈالا۔

سرسید آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن میں رقمطراز ہیں۔ ''اس نسخۂ دلکشا کو زیورا تمام سے آراستہ کر اس مناسبت سے کہ صنادید روزگار آثار اور اعیان مملکت ہند کے احوال واطوار پر مشتمل ہیں آثار الصنادید نام رکھا۔''

گمان غالب ہے کہ سرسید کی کتاب کا نام ''آثار الصنادید'' خاقانی کے مذکورہ اسی شعر سے ماخوذ ہے۔ منشی رحمت اللہ نے ''آثار الصنادید'' کے 190 کے کانپور ایڈیشن میں خاقانی کے اس شعر کو صفحۂ اول پر تحریر کیا ہے۔

دہلی کے آثار قدیمہ پر اب تک دریافت شدہ کتابوں میں پہلی کتاب مرزا سنگین بیگ کی ''سیر المنازل'' ہے۔ جو فارسی زبان میں لکھی گئی۔ کتاب کے شروع میں انھوں نے لکھا ہے کہ ''چارلس تھیوفلس مٹکاف اور ولیم فریزر کے ترغیب دلانے پر میں نے یہ تاریخ امورات دہلی اور احوال مکانات لکھی تھی۔''(1) اس کتاب میں آثار قدیمہ کے ذکر کے علاوہ دہلی کی مختصر تاریخ، گلی کوچوں مکانوں، کتبوں اور اہم شخصیات کا ذکر ملتا ہے۔

ڈبلیو فرینکلین نے "An Account of Modern Delhi" کے نام سے ایک رسالہ تحریر کیا تھا اس رسالے میں اس نے دلی کے باغات او رمحلات بازاروں اور قلعوں کا ذکر کیا ہے۔ سرتھامس مٹکاف کی کتاب 1844 "Reminisceznvrss of Imperial Delhi" میں شائع ہوئی۔ یہ وہی مٹکاف ہے۔ جس کے نام سرسید نے ''آثار الصنادید'' کا پہلا ایڈیشن معنون کیا تھا۔

''آثار الصنادید'' دہلی کی تاریخ عمارتوں اور اس دور کی اہم شخصیات پر ایک نادر دستاویز ہے اس کا بنیادی محرک ہندوستان میں اسلامی تہذیب وثقافت اور اس کی عظمت رفتہ کو تاریخ کے صفحات میں محفوظ کرنا تھا۔ یہ تصنیف سرسید کی اوائل عمر کی کاوش ہے جب ان کی عمر انیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ حالی نے ''حیات جاوید'' میں لکھا ہے ''اسی زمانے میں جب وہ دلی میں منصف تھے ان کو عمارات شہر اور نواح شہر کی تحقیقات کا خیال ہوا وہ کہتے تھے: میں اپنی کل تنخواہ والدہ کو دے دیتا تھا وہ اس میں سے صرف پانچ روپئے مہینہ اوپر کے خرچ کے لیے مجھ کو دیتی تھیں باقی تمام اخراجات ان کے ذمے تھے، جو کپڑا وہ پہنا دیتی تھیں پہن لیتا تھا اور جیسا کھانا وہ کھلا دیتی تھیں کھا لیتا تھا اس کا سبب یہ تھا کہ ان کی آمدنی گھر کے اخراجات کو مشکل سے مکتفی ہوتی تھی۔ ان کے بڑے بھائی کا انتقال ہو چکا تھا جس سے سو روپئے ماہوار کی آمدنی کم ہو گئی تھی قلعے کی تنخواہیں تقریباً کل بند ہو گئی تھیں کرائے کی آمدنی بہت قلیل تھیں صرف سرسید کی تنخواہ کے سو روپئے ماہوار تھے اور سارے کنبے کا خرچ تھا۔ سرسید ابتدا ہی سے نہایت فراخ حوصلہ اور کشادہ دل تھے خرچ کی تنگی کے سبب اکثر منقبض رہتے تھے لہٰذا ان کو یہ خیال ہوا کہ کسی تدبیر سے یہ تنگی رفع ہو۔ سید الاخبار جو ان کے بھائی کا جاری کیا ہوا اخبار تھا کچھ تو اس کو ترقی دینی چاہی اور کچھ عمارات دہلی کے حالات ایک کتاب کی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ کیا۔(2)

حالی کا مذکورہ بیان کس حد تک استناد کا درجہ رکھتا ہے یہ غور طلب ہے سرسید منصف ہونے کے باوجود تنگ دستی اور عسرت میں زندگی گزار رہے تھے اور انھوں نے ''آثار الصنادید'' مالی منفعت کے لیے لکھی تھی: دراصل سرسید بنیادی طور پر تاریخ کے آدمی تھے انھیں تاریخ نویسی سے گہری دلچسپی اور لگاؤ تھا۔ اس ضمن میں ''تاریخ سرکشی ضلع بجنور'' اور ''اسباب بغاوت ہند'' کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ یوں بھی ماضی باز آفرینی اس دور کا حل نہ تھا۔

سرسید نے کہا ہے کہ ''قطب مینار کے بعض کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جاتے تھے ان کے پڑھنے کو ایک جھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوا لیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربہ اتارتا تھا جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرط محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔''

سرسید کی محنت شاقہ اور مسلسل جدوجہد کے بعد آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن 1847 میں مولانا صہبائی کی مدد سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا یہ نسخہ چار ابواب پر مشتمل تھا اور اس میں ایک سو بیس عمارتوں کا ذکر ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی حکمرانوں کی تعمیر کرائی ہوئی عمارتیں شامل ہیں۔ حویلیوں، مسجدوں،

مندروں، بازاروں، باولیوں اور کنوؤں وغیرہ کی تفصیلات دی گئی ہیں چوتھے باب میں ایک سو بیس مشائخ، علما، اطبا، شعرا، خطاط مصور اور قرا کا ذکر ملتا ہے۔

مسٹر رابرٹس جوان دنوں دہلی میں مجسٹریٹ تھے'' آثارالصنادید'' کا ایک نسخہ اپنے ساتھ انگلینڈ لے گئے تھے انھوں نے اس تصنیف کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے اراکین کے سامنے پیش کیا سوسائٹی کے اراکین نے اس کو بہت پسند کیا مسٹر رابرٹس نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہا لیکن بعض نامساعد حالات کی وجہ سے یہ کام نہیں ہو سکا۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ سرسید نے'' آثارالصنادید'' سرطامس منکاف کی تحریک یا ایما پر لکھی تھی لیکن سرسید کی کسی بھی تحریر میں اس بات کا ذکر نہیں ملتا۔

تذکرۂ سرسید میں لکھا ہے کہ:

'' یہ علمی کارنامہ سراسر ان کے ذاتی ارادے اور تائید ایزدی کا مرہون منت ہے، البتہ آزردہ، صہبائی اور شیفتہ کے ساتھ دوستانہ اور شاگردانہ صحبتوں نے ان کے مشرقی علوم کے ذوق کو مزید جلا بخشی۔'' (تذکرۂ سرسید صفحہ -8)

'' آثارالصنادید'' کی پہلی اشاعت کی زبان مسجع اور مقفی تھی کہ وہ دور عبارت آرائی کا دور تھا۔ 1854 میں سرطامس کی ایما پر جب انھوں نے کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا تو اس پر نظر ثانی کی، پہلا ایڈیشن چھ سو صفحات پر مشتمل تھا۔ جبکہ دوسرا ایڈیشن دو سو چوراسی صفحات پر مشتمل ہے، حالی کے بیان کے مطابق دوسرے ایڈیشن کے تقریباً تمام ترنسخے غدر میں تلف ہو گئے۔ دوسرے ایڈیشن کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہوا۔ علاوہ ازیں گارساں دتاسی نے 1861 میں اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں شائع کر کے اس کی ایک جلد سرسید کو بھی ارسال کی تھی۔

'' آثارالصنادید'' کے چھ ایڈیشن مختلف اوقات میں شائع ہوئے

سال اشاعت	طابع و ناشر	مرتب
1847	مطبع سید الاخبار دہلی	سرسید احمد خاں
1854	مطبع سلطانی دہلی	سرسید احمد خاں
1856	مطبع نولکشور لکھنؤ	اشاعت اول کاری پرنٹ
1900	مطبع نولکشور لکھنؤ	اشاعت اول کاری پرنٹ
1904	نامی پریس کانپور	منشی رحمت اللہ رعد
1965	سینٹرل بک ڈپو دہلی	خالد نصیر ہاشمی
1966	پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی	ڈاکٹر معین الحق
1990	اردو اکادمی دہلی	خلیق انجم

مذکورہ آٹھ اشاعتوں کے علاوہ پہلے ایڈیشن کا باب چہارم قاضی احمد میاں جوناگڑھی نے تذکرۂ اسلامی'' کے عنوان سے کراچی سے شائع کیا تھا۔ علاوہ ازیں'' مقالات سرسید'' حصہ دہم مرتبہ مولوی محمد اسماعیل میں شامل اشاعت ہوا۔'' آثارالصنادید'' کا پہلا ایڈیشن چار ابواب پر مشتمل تھا لیکن دوسرے ایڈیشن میں سرسید نے چوتھے باب کو حذف کر دیا تھا حالانکہ یہ ایک اہم باب تھا۔ دہلی کے آثار قدیمہ کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے زیادہ ہے جبکہ سرسید نے صرف '' آثارالصنادید'' میں ڈیڑھ سو عمارتوں کا ذکر کیا ہے۔[3] '' آثارالصنادید'' میں سرسید کے بیانات کس حد تک قابل قبول اور مستند ہیں اس کا حتمی فیصلہ تاریخ داں ہی کر سکتے ہیں لیکن عام طور پر'' آثارالصنادید'' کے بیانات کو قابل اعتماد سمجھا گیا ہے۔

آثارالصنادید کے ابتدائی دو ایڈیشن جو سرسید نے خود شائع کیے اہمیت کے حامل ہیں باقی تمام ایڈیشن یا ری پرنٹ انھیں دونوں اشاعتوں کی نقل ہیں۔ جو مختلف اوقات اور مختلف انداز میں شائع ہوتے رہے۔ آخری ایڈیشن 1990 میں دہلی اردو اکادمی سے شائع ہوا تھا جو تین جلدوں میں ہے اور جس کے مرتب خلیق انجم ہیں۔ انھیں دنوں راقم الحروف نے ان تینوں جلدوں پر تبصرہ بھی کیا تھا جو'' کتاب نما'' دہلی نے شائع کیا تھا۔ ان تینوں جلدوں میں خلیق انجم نے دہلی کی تاریخی عمارتوں کی چند تصویروں کا اضافہ کیا ہے اور بعض کی موجودہ حالت پر بھی روشنی ڈالی ہے لیکن یہ کوئی غیر معمولی کام نہیں ہے۔

ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ سرسید کو '' آثارالصنادید'' لکھنے کی تحریک '' سیرالمنازل'' سے ملی ہوگی۔ انیس سال کی عمر میں سرسید نے'' آثارالصنادید'' لکھنے کا بیڑا اٹھایا اور ڈیڑھ سال کے عرصے میں یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ'' آثارالصنادید'' عجلت میں لکھی گئی اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس میں انشا کی کچھ خامیاں راہ پا گئیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے سرسید کی نثر میں جن فقروں کی کمزور شیرازہ بندی اور فقروں کے اندر لفظوں کی ناہموار خشت بندی کا ذکر کیا ہے'' آثارالصنادید'' میں اس طرح کی متعدد مثالیں مل جاتی ہیں۔ مثلاً رموز واوقاف کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی۔ عبارت میں جملے طویل ہیں اور ان میں ایک قسم کا الجھاؤ پایا جاتا ہے ان کے یہاں کہیں واقعہ نگاری کے بجائے قصہ نگاری کا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ کتاب میں نہ تو زمانی ترتیب قائم کی گئی ہے اور نہ ہی حروف تہجی کا خیال رکھا گیا ہے۔ دوستوں پر لکھتے وقت وہ جذباتی نظر آتے ہیں مثلاً نواب ضیاء الدین احمد خاں آزردہ صہبائی، ذوق اور غالب وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے ان کا قلم مبالغے کی تمام حدیں پھلانگ جاتا ہے۔

سرسید کی شخصیت کثیر الجہات تھی اس لیے ان کے کارنامے بھی متنوع ہیں۔ ایک طرف انھیں تاریخ سے دلچسپی ہے تو دوسری طرف حالات حاضرہ پر بھی ان کی نظر ہے۔ وہ مصلح قوم بھی ہیں اور ماہر تعلیم بھی۔ مصنف بھی رہے

ہیں اور منتظم بھی، صحافت سے بھی لگاؤ ہے اور انشا پردازی سے بھی۔ وہ ایک اعلیٰ پائے کے خطیب بھی تھے اس لیے ان کے طرزِ تحریر اور ان کے اسلوب میں بھی خطیبانہ انداز نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر شہناز انجم نے ''آثارالصنادید'' کے خطی نسخے اور مطبوعہ نسخے کے اسلوب میں واضح طور پر فرق ثابت کیا ہے۔

اپنی کچھ کمیوں کے باوجود سرسید احمد خاں کی ''آثارالصنادید'' آثاریات کے موضوع پر ایک ایسی دستاویز ہے جو انیسویں صدی کے نصف اول کے دہلی کے تہذیبی، علمی، ادبی، ثقافتی اور تاریخی منظرنامے کو سمجھنے کے لیے غیر معمولی اہمیت اور قدر و قیمت کی حامل ہے۔

حواشی:

1. حیات جاوید، حالی پنجاب اکادمی لاہور، ص-121
2. حیات جاوید، حالی، ایڈیشن 1982، مطبوعہ ترقی اردو بیورو نئی دہلی ص-63-62
3. آثارالصنادید جلد اول مرتبہ خلیق انجم دہلی اردو اکادمی 1990 ص-152

□□□

پتہ:
Urdu Teaching & Research Centre,
Central Institute of Indian Languages,
HRD, Govt. of India,
SAPROON-SOLAN (H.P.)

فورٹ ولیم کالج کے نسخۂ کلیات میر (مطبوعہ 1811) کے بعد کلام میر کا صحیح ترین اور مکمل ترین نسخہ

کلیات میر (دو جلدوں میں)

جلد اول (مکمل چھ دیوان غزلیات) صفحات: 870 ● قیمت 402 روپئے مجلد، 336 روپے غیر مجلد ● سائز: 20X26X8

مرتب: ظل عباس عباسی ● بہ تصحیح و اضافہ: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

جلد دوم (قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ) صفحات: 632 ● قیمت 430 روپئے مجلد، 410 روپئے غیر مجلد

تحقیق و ترتیب: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

- اس نسخے کو تمام اہم اور قابل ذکر مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے اور بقدر ضرورت قلمی نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔
- کلام میر میں مستعمل بے شمار نادر اور نامانوس الفاظ کی صحت و درستی کو بڑی حد تک یقینی بنایا گیا ہے۔
- نسخۂ عباسی جو صرف غزلیات پر مشتمل تھا اس میں نسخۂ محمود آباد سے بہت سارا کلام لے کر اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اب جلد اول میں غزلیات کی کل تعداد 1916 ہے جو ابھی تک کے تمام مطبوعہ نسخوں سے زیادہ ہے۔ غزلیات میں اشعار کی کل تعداد 13908 ہے۔
- جلد دوم میں میر کے تمام مرثیوں کو پہلی بار پوری صحت کے ساتھ مکمل صورت میں سامنے لایا گیا ہے۔
- جلد دوم میں منظومات کو پہلی بار بالکل نئی، مناسب اور با اصول ترتیب سے رکھا گیا ہے۔ اس طرح نسخے میں شامل کسی بھی منظومے کو تلاش کر لینا آسان ہو گیا ہے۔
- دونوں جلدوں میں متن کی تصحیح کے دوران مختلف مستند اور بعض نادر لغات اور فرہنگوں کا سہارا لیا گیا ہے۔
- جلد دوم میں دو تفصیلی دیباچے شامل ہیں۔ احمد محفوظ کے دیباچے میں کلام میر کی تدوین و تصحیح متن سے متعلق نہایت اہم امور زیر بحث لائے گئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے دیباچے میں مثنویات میر اور میر کے عمومی کلام پر ایک بالکل نئے پہلو سے گفتگو کی گئی ہے۔
- جلد اول میں دیگر مضامین کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی کا دیباچہ نما ایک نیا مضمون ''تمہید'' کے عنوان سے شامل ہے۔
- ان دونوں جلدوں کو بڑے سائز پر سفید کاغذ اور عمدہ کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اور سرورق ایسا ہے جو میر کے زمانے کی تہذیبی و ثقافتی روایت کی عکاسی کرتا ہے۔

کلیات میر (جلد اول و دوم) ملک کے تمام بڑے کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہے۔ اردو کونسل سے براہ راست بھی طلب کی جا سکتی ہے۔

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

فرانز کافکا

قانون کے دروازے پر

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ (ستمبر 2009) پڑھ کر ہاتھ سے رکھا ہی تھا کہ عظیم آباد سے نکلنے والے لعل اردو میگزین ''یہ پل'' کے شمارہ 8-7 پر نظر پڑی۔ اس میں فرانز کافکا کی ایک کہانی کا ترجمہ بہ عنوان ''قانون کے دروازے پر'' شائع ہوا ہے۔ مترجم کا نام درج نہیں۔ یہ کہانی قانونی عمل کو بے اثر کردینے والے انھی ہتھکنڈوں کی عکاسی ہے جن کا ذکر آپ نے صدر جمہوریہ کی تقریر کے حوالے سے ''ہماری بات'' میں کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظام انصاف کو بے دست و پا کر دینے والا موذی مرض عالمگیر بھی ہے اور خاصا پرانا بھی اور اس کا تدارک آسان نہیں۔ کافکا کی کہانی مختصر ہے مگر اس اختصار میں بہت سی تفصیلات مضمر ہیں۔ کہانی درج ذیل ہے۔ آپ مناسب سمجھیں تو اپنے قارئین کی دلچسپی بلکہ میں تو کہوں گی عبرت کے لیے ''اردو دنیا'' کے صفحات پر جگہ دے دیں۔

آپ کے رسالے کی ایک قاری

سعید النسا

جے-3 /143 کرشنا گنج،

نزد انار والی مسجد، دہلی-92

قانون کے دروازے پر رکھوالا کھڑا ہے۔ اس ملک کا ایک عام آدمی اس کے پاس آکر قانون کے سامنے پیش ہونے کی اجازت مانگتا ہے۔ مگر اسے وہ اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔

آدمی سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ پھر پوچھتا ہے، ''کیا کچھ وقت بعد میری سنی جائے گی؟''

''دیکھا جائے گا۔'' رکھوالا کہتا ہے، ''لیکن اس وقت تو قطعی نہیں۔''

قانون کا دروازہ ہمیشہ کی طرح آج بھی کھلا ہوا ہے۔ آدمی اندر جھانکتا ہے۔ اسے ایسا کرتے دیکھ کر رکھوالا ہنسنے لگتا ہے۔ ''میرے منع کرنے کے باوجود تم اندر جانے کو اتنے اتاولے ہو تو پھر کوشش کرکے کیوں نہیں دیکھتے؟ لیکن یاد رکھنا، میں بہت سخت ہوں، جب کہ میں دوسرے رکھوالوں سے بہت چھوٹا ہوں۔ یہاں ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک ہر ایک دروازے پر ایک رکھوالا ہے اور ہر رکھوالا دوسرے سے زیادہ طاقتور ہے۔ کچھ کے سامنے جانے کی ہمت تو مجھ میں بھی نہیں ہے۔''

آدمی نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ قانون تک پہنچنے میں اتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ تو یہ سمجھتا تھا کہ قانون تک ہر آدمی کی پہنچ ہر وقت ہونی چاہیے۔ پھر کوٹ والے رکھوالے کی نکیلی ناک، بکھری لمبی سیاہ داڑھی کو نزدیک سے دیکھنے کے بعد وہ اجازت ملنے تک باہر ہی انتظار کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

رکھوالا اسے دروازے کے ایک طرف اسٹول پر بیٹھنے دیتا ہے۔ یہاں تک کہ برسوں بیت جاتے ہیں۔ اس بیچ وہ اندر جانے کے لیے رکھوالے کے آگے کئی بار گڑگڑاتا ہے۔ رکھوالا بیچ بیچ میں بے دلی سے اس سے اس کے گھر اور دوسری بہت سی باتوں کے بارے میں پوچھنے لگتا ہے۔ لیکن ہر بار اس کی بات چیت اسی فیصلے کے ساتھ ختم ہوجاتی ہے کہ ابھی اسے داخلہ نہیں مل سکتا۔

آدمی نے سفر کے لیے جو بھی سامان اکٹھا کیا تھا اور دوسرا جو کچھ بھی اس کے پاس تھا، سب رکھوالے کو خوش کرنے میں خرچ کر دیتا ہے۔ رکھوالا اس سے سب کچھ اس طرح سے قبول کرتا ہے، گویا اس پر احسان کر رہا ہو۔

برسوں تک امید بھری نگاہوں سے رکھوالے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ دوسرے رکھوالوں کے بارے میں بھول جاتا ہے۔ قانون تک پہنچنے کے راستے میں واحد وہی رکھوالا اسے رکاوٹ نظر آتا ہے۔ وہ آدمی جوانی کے دنوں میں اونچی آواز میں اور پھر بوڑھا ہونے پر ہلکی بدبداہٹ میں اپنی قسمت کو کوستا رہتا ہے۔ وہ بچے جیسا ہوجاتا ہے۔ برسوں سے رکھوالے کی طرف ٹکٹکی لگائے رہنے کی وجہ سے وہ اس کے فرکالر میں چھپے پسوؤں کے بارے میں جان جاتا ہے۔ وہ پسوؤں کی بھی خوشامد کرتا ہے، تاکہ وہ رکھوالے کا دماغ اس کے حق میں کردیں۔ بالآخر اس کی آنکھیں جواب دینے لگتی ہیں۔ وہ سمجھ نہیں پاتا کہ دنیا واقعی پہلے سے زیادہ اندھیری ہوگئی ہے یا پھر اس کی آنکھیں اسے دھوکہ دے رہی ہیں۔ لیکن ابھی بھی وہ چاروں طرف کی تاریکی کے بیچ قانون کے دروازے سے پھوٹتی روشنی کے دائرے کو محسوس کر پاتا ہے۔

وہ نزدیک آتی موت کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ مرنے سے پہلے ایک سوال، جو برسوں کے انتظار کے بعد اسے تنگ کر رہا تھا، رکھوالے سے پوچھنا چاہتا ہے۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے رکھوالے کو پاس بلاتا ہے، کیوں کہ بیٹھے بیٹھے اس کا جسم اس قدر اکڑ جاتا ہے کہ وہ چاہ کر بھی اٹھ نہیں پاتا۔ رکھوالے کو اس کی طرف جھکنا پڑتا ہے کیوں کہ قد میں کافی فرق آنے کی وجہ سے وہ کافی ٹھگنا نظر آرہا تھا۔

''اب تم کیا جاننا چاہتے ہو؟'' رکھوالا پوچھتا ہے

''قانون تو ہر ایک کے لیے ہے''، آدمی کہتا ہے، ''لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اتنے برسوں میں میرے علاوہ کسی دوسرے نے یہاں داخل ہونے کے لیے دستک کیوں نہیں دی؟''

رکھوالے کو سمجھتے دیر نہیں لگتی کہ وہ آدمی آخری گھڑیاں گن رہا ہے۔ وہ اس کے بہرے ہوتے کان میں چلا کر کہتا ہے، ''کسی دوسرے کے لیے یہاں داخل ہونے کا کوئی مطلب نہیں تھا، کیوں کہ قانون تک پہنچنے کا یہ دروازہ صرف تمھارے لیے ہی کھولا گیا تھا اور اب میں اسے بند کرنے جا رہا ہوں۔''

□□□

غزلیاتِ فائز

نواب صدرالدین محمد خاں بہادر دہلی کے ایک امیر تھے جو اورنگ زیب کے آخری عہد سے محمد شاہ کے زمانے تک موجود تھے خاندانی اعزاز اور ذاتی وجاہت کے علاوہ علم و فضل کی دولت سے بہرہ مند اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے فائز ان کا تخلص تھا۔ ان کے بزرگوں میں مراد علی خاں دہلی کے منصب داروں میں تھے مرحوم سید مسعود حسن رضوی ادیب نے انھیں شمالی ہند میں اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ ''اردو کے صاحب دیوان شاعروں میں ان سے زیادہ قدیم کوئی شاعر اب تک معلوم نہیں۔'' رضوی صاحب کی کتاب ''شمالی ہند میں اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر نواب صدرالدین محمد خاں فائز دہلوی اور اس کا دیوان'' 1946 میں انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے شائع کی تھی۔ یہ کتاب جو اب تقریباً نایاب ہے، اس تک ہماری رسائی سید تنویر حسین صاحب کی وساطت سے ہوئی۔ ہم ان کے ممنون ہیں۔

جانِ ایام دلبری ہے یاد
سیرِ گلزار ے خوری ہے یاد
دیکھتا نئیں سورج کوں وہ نظرا بھرن
جس کوں تجھ جامۂ زری ہے یاد
خوب پھولی تھی باغ میں نرگس
گلِ صد برگ و جعفری ہے یاد
وہ چراغاں وہ چاندنی کی رات
سیرہت پھولو پھلجھڑی ہے یاد
وہ تماشا وہ کھیل ہولی کا
سب کے تن رخت کیسری ہے یاد
ہو دیوانا جنگل میں کیوں نہ پھرے
جس کوں وہ سایۂ پری ہے یاد
اے سیہ مست میری انکھیوں کوں
لال بادل کی تجھ پری ہے یاد
جب تمن پاس فائز آیا تھا
بات کہتا تھا بے سری ہے یاد

●

تری گالی مجھ دل کوں پیاری لگے
دعا میری تجھ من میں بھاری لگے
تدی قدر عاشق کی بوجھے سجن
کسی ساتھ اگر تجھ کوں یاری لگے
بھلا دیوے وو عیش و آرام سب
جسے زلف سیں بے قراری لگے
نہیں تجھ سا اور شوخ اے من ہرن
تری بات دل کوں نیاری لگے
بھواں تیری شمشیر و زلفاں کمند
پلک تیری جیسے کٹاری لگے
ہووے سرد بازار دامن کا دیکھ
اگر گرد دامن کناری لگے
نہ جانوں تو ساقی تھا کس بزم کا
نین تیری مجھ کوں خماری لگے
وہی قدر فائز کی جانے بہت
جسے عشق کا زخم کاری لگے

●

سجن مجھ پر بہت نا مہرباں ہے
کہاں وو عاشقاں کا قدرداں ہے
کہوں احوال دل کا اس کو کیوں کر
بہت نازک مزاج و بدزباں ہے
مرا دل بند ہے اس نازنیں پر
عجب اس خوش لِقا میں ایک آں ہے
بھواں شمشیر ہیں وو زلف پھانسی
ہر اک پلک اس کی مانندِ سناں ہے
چندر بے و قر ہے اس بدر آگے
صفا اس مکھ کی ہر اک پر عیاں ہے
سمجھتا ہے ترے اشعار فائز
خدا کے فضل سوں وہ نکتہ داں ہے

●

رجب علی بیگ سرور

کلاسیکی ادب

قصہ جان عالم اور انجمن آرا کا

کہتے ہیں ملک ختن میں ایک شہر تھا۔ فسحت آباد، ایسا پُر رونق اور ایسا خوب صورت کہ جنت اس کے گلی کوچوں کو دیکھ کے شرمائے، جو دیکھے یہیں رہنے کی تمنا کرے۔ یہاں کے بازاروں کی چہل پہل دیکھنے کے قابل، سڑکیں ہموار اور صاف شفاف، مکانات مضبوط اور شاندار۔ اس شہر میں بسنے والے ہر طرح خوش اور خوش حال۔ اس ملک کا بادشاہ بھی بڑی شان وشوکت والا تھا۔ اس کے خدمت گار بھی ایسے تھے کہ سکندر اور دارا جیسے بادشاہ بھی کیا ہوں گے اس بادشاہ کا نام فیروز بخت تھا۔

اس میں شک نہیں کہ فیروز بخت قسمت کا سکندر تھا۔ اللہ نے سب کچھ دیا تھا مگر اس کے کوئی اولاد نہ تھی اور ہر وقت رو رو کے اللہ سے دعا کرتا تھا کہ اسے ایک بیٹا بخش دے۔ آخر اس کی دعا قبول ہوئی اور اس کے یہاں بیٹا پیدا ہوا۔ باپ نے جان عالم نام رکھا۔ جان عالم کو خدا نے وہ صورت شکل دی تھی کہ چودھویں کا چاند اس کی برابری نہ کر سکے۔ یہ بچہ کیا پیدا ہوا محل میں عید ہوگئی۔ بادشاہ نے اس خوشی میں اپنی رعایا کو بھی شریک کیا۔ ہزاروں قیدیوں کو رہا کیا۔ اَن گنت لونڈی غلام آزاد کیے۔ شاہی خزانہ ایسا کھلا کہ ملک میں کوئی محتاج نہ رہے۔ ایک سال کا خراج غریب رعایا کو معاف کیا۔ جگہ جگہ مسجدیں، مدرسے، سرائیں اور مسافر خانے تعمیر کیے۔ غرض یہ کہ سارے شہر میں خوب دھوم دھام ہوئی اور ساری رعایا شاد کام ہوئی۔

نجومی، پنڈت بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوئے اور حساب لگا کے بولے ''مہاراج کا بول بالا رہے۔ ہماری پوتھی بتاتی ہے کہ شہزادہ بڑا قسمت والا ہے۔ بھگوان چاہے تو جلد راج پر براجے، چاروں کھونٹ نام باجے، ایسا بیاہ ہو کہ سنسار میں دھوم مچے۔ مگر پندرھواں برس بھاری ہے۔ ایک پکھیرو شہزادے کے ہاتھ آئے گا، تریا کی کھٹ پٹ سے وہ بچن سنائے گا کہ شہزادہ راج پاٹ چھوڑ کے دیس بدیس بھٹکے گا، کوئی اس کے پاس نہ پھٹکے گا۔ شہزادہ اَن گنت کشٹ اٹھائے گا۔ پر ایک دن چھٹکارا پائے گا۔ ایک سندر رانی ہاتھ آئے گی جو چرنوں پر جی دارے گی۔ اس رانی کا باپ بگڑے کام بنائے گا اور ایسے گُر سکھائے گا جس سے بیری مارے جائیں اور منہ کی کھائیں۔ ایسا سمے بھی آئے گا کہ نرناری لڑیں گے اور پرتھوی پر بل چل پڑے گی۔ اپنے چھوٹ جائیں گے۔ نگر نگر کھوج کرائیں گے۔ پر سب بچھڑے مل جائیں گے۔ شہزادہ راج کرے گا۔ دیا دھرم کے کاج کرے گا۔ بھگوان کی دیا سے جان کی لکیر ہے پر دور پار کی دھرتی کی سیر ہے۔''

بادشاہ نے نجومیوں کی یہ باتیں سنیں تو بڑا غمگین ہوا۔ پھر بولا ''اللہ جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔'' آخر سب کو انعام سے مالا مال کر کے رخصت کیا۔ اب شہزادے کی پرورش کی طرف توجہ کی اور ایسا انتظام کیا کہ کسی بات کی کمی نہ رہ جائے۔ اس نے بھی وہ ہاتھ پاؤں نکالے کہ جو دیکھے حیران ہو۔ دس برس کا تھا مگر پورہ جوان دکھائی دیتا تھا۔ طاقت ایسی کہ ہرن کے سینگ چیر ڈالے، مست ہاتھی کے ٹکڑے کردے، جو جو ہنر شہزادے سیکھتے ہیں وہ الگ حاصل کیے صورت شکل پہلے ہی بے مثال تھی۔ اب تندرستی میں بھی لاجواب ہے۔ ہر فن میں کمال حاصل ہوا۔ چودھواں برس پورا ہونے لگا تو درباریوں نے صلاح دی کہ اب شہزادہ اللہ کے کرم سے جوان ہوا، شادی کا بندوبست ہونا چاہیے۔ تلاش شروع ہوئی۔ آخر ایک بہت خوب صورت اور نیک طبیعت شہزادی ماہ طلعت سے جان عالم کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوگئی۔

شہزادے کا توتا خریدنا اور انجمن آرا کے حسن کا ذکر سننا

شادی کے بعد بادشاہ کی اجازت سے شہزادہ جان عالم صبح شام گھوڑے پر سوار ہو کر سیر کو نکلنے لگا۔ ایک دن بازار سے شہزادے کا گزر ہوا۔ ایک جگہ بھیڑ نظر آئی۔ دیکھا ستر اسی برس کا ایک آدمی نہایت بوڑھا ہاتھ میں توتے کا پنجرا لیے کھڑا ہے۔ شہزادے کو دیکھ کر توتے نے اپنے مالک سے کہا'' لے تیرا نصیب جاگا۔ تیری غریبی اب کوئی گھڑی کی مہمان ہے۔ میں کیا ہوں۔ ایک مٹھی پَر اور ہڈی کا کھا جا مگر شہزادہ مجھے پسند کرلے تو ابھی موتیوں سے تیرا دامن بھر دے۔''

شہزادے نے ایک پرندے کو یوں فرفر بولتے سنا تو حیران رہ گیا، عقل کے توتے اُڑ گئے۔ پنجرہ ہاتھ میں لے کے دام پوچھے۔ بوڑھا جواب دینے ہی کو تھا کہ توتا جھٹ سے بول پڑا'' غریب کے مال کا مول کون دیتا ہے۔ سب اونے پونے لے لیتے ہیں۔''

جان عالم نے لاکھ روپے تو قیمت دی اور انعام الگ سے دیا۔ شہزادہ توتے کا پنجرہ لیے محل میں داخل ہوا اور ماہ طلعت کو توتا دکھا کے بولا۔

بازار ہم گئے تھے اک چوٹ مول لائے

توتے نے شہزادے کو ایسے ایسے مزیدار قصے اور چٹ پٹے شعر سنائے کہ سوتے جاگتے اس کی جدائی گوارہ نہ تھی۔ دربار جاتا تو پنجرہ ماہ طلعت کو سونپ جاتا اور تاکید کر جاتا کہ اس کی دیکھ بھال میں کسی طرح کی نہ ہو۔

ایک دن شہزادہ دربار گیا، تو تا محل میں رہا۔ اس روز ماہ طلعت نے غسل

کیا اور شان دار لباس پہن کے جڑاؤ کرسی پر بیٹھی۔ پھر آئینے میں صورت دیکھی تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ کنیزوں سے پوچھا ''بتاؤ تو میں کیسی ہوں۔'' ہر ایک نے جی کھول کے تعریف کی۔ کسی نے کہا ''عید کا چاند ہو۔'' کوئی بولی ''ایسی حسین ہو کہ کہیں دیکھا نہ سنا۔'' کسی نے کہا ''حور پری مقابلے پر آئے تو شرما جائے۔''

چاروں طرف سے خوب خوب تعریفیں ہو چکیں تو شہزادی توتے کی طرف متوجہ ہوئی۔ بولی ''اے عقل مند پرندے! تو نے دنیا جہاں کی سیر کی ہے۔ ہزاروں ایک سے ایک بڑھ کے حسین دیکھے ہوں گے۔ سچ کہنا کوئی ہم سا بھی کہیں نظر سے گزرا؟ میاں توتے اس وقت خفا اور کچھ پھولے پھولے سے بیٹھے تھے، ماہ طلعت کی بات پر دھیان نہ دیا۔ وہاں ایک تو سلطنت کا زور دوسرے صورت کا گھمنڈ، جل کے بولی ''میاں مٹھو! کچھ جینے سے خفا ہو کہ ہماری بات پر دھیان نہیں دیتے۔''

توتے نے کہا ''سوال جواب اور بات ہے۔ دھمکانا، حکومت سے ڈرانا اور غصے کی آنکھ دکھانا اور بات ہے۔ بیکار کیوں الجھتی ہو۔ شاید تم ہی سچی ہو۔'' یہ جواب سن کے تو وہ اور بھی آگ بگولا ہوئی۔ جھنجھلا کے بولی ''کیوں جانور بدتمیز، ناچیز تیری موت آئی ہے۔ کیا بیہودہ ٹیں مچائی ہے۔ بے تک بک رہا ہے۔ ہمارا مرتبہ نہیں سمجھتا۔''

توتے نے جواب دیا کیوں اتنی خفا ہوتی ہو۔ آئینے میں اپنا منہ دیکھو۔ ہاں صاحب، تم بڑی خوب صورت ہو۔''

ادھر یہ تکرار ہو رہی تھی کہ جان عالم محل میں داخل ہوا۔ دیکھا شہزادی غصے سے تھر تھر کانپ رہی ہے، آنکھوں میں آنسو ہیں اور توتے سے بحث ہو رہی ہے۔ پوچھا ''کیا بات ہے۔ خیر تو ہے؟''

توتا بولا ''آج تو قیامت ٹوٹی ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ کچھ زندگی باقی تھی اور ابھی کچھ اس قفس کا دانہ پانی قسمت میں تھا ورنہ آج شہزادی صاحبہ کے ہاتھوں جان گئی ہوتی۔ آپ لوٹ کے جیتا نہ پاتے۔ پنجرہ خالی پا کے افسوس کرتے کہ۔

طوطا ہمارا مر گیا کیا بولتا ہوا۔''

ماہ طلعت نے توتے کی یہ باتیں سنیں تو اور غصہ آیا۔ شہزادے سے کہا ''اگر میری بات کا توتا صاف جواب نہ دے گا تو اس گھوڑے کی گردن مروڑ اپنے تلوؤں سے اس کی آنکھیں ملوں گی جب دانہ پانی کھاؤں پیوں گی۔''

جان عالم نے کہا ''کچھ حال تو کہو۔''

توتے نے عرض کی ''حضور! ساری کہانی اس غلام سے سنیے۔ آج شہزادی صاحبہ نہا دھو کے اور خوب بناؤ سنگھار کر کے بیٹھیں اور۔

دیکھ آئینے کو کہتی تھیں کہ اللہ رے میں

پھر اس غریب سے سوال ہوا کہ ''بول تو نے ہماری سی صورت دیکھی ہے۔'' مجھ بیچارے کے منہ سے نکل گیا کہ ''خدا نہ کرے۔'' اب اس خطا کی سزا پاتا ہوں۔''

جان عالم نے کہا ''تم بھی کمال کرتی ہو۔ تم تو سچ مچ پری ہو مگر عقل سے خالی ہو کہ جانور کی بات کا اتنا خیال کرتی ہو۔ بولتا ہے تو کیا ہوا۔ آخر ہے تو جانور۔ یہ نادان کیا جانے۔''

میاں مٹھو کو یہ باتیں بہت ناگوار ہوئیں۔ آنکھ بدل کے روکھی صورت بنائی اور ٹیں سے بولا۔ ''سرکار جھوٹ جھوٹ ہے، سچ سچ ہے۔ جس کے برابر کوئی نہیں وہ ذات تو صرف خدا کی ہے ورنہ دنیا میں ایک سے ایک بڑھ کر موجود ہے۔''

اب تو جان عالم سے رہا نہ گیا۔ مجبور ہو کر کہا ''جو ہو سو ہو۔ مٹھو پیارے اب تو سچ کہہ دو۔'' توتے نے عرض کیا ''سچ کبھی کبھی بہت مہنگا پڑتا ہے۔ جو سچ مصیبت میں ڈالے اس سے جھوٹ بہتر۔ سچ نہ بلوایئے اور میرا منہ نہ کھلوایئے۔ ورنہ در در کی ٹھوکریں کھانی ہوں گی اور ملکوں ملکوں کی خاک چھاننی ہوگی۔''

یہ سن کے جان عالم اور بے تاب ہوا۔ بولا ''بس اب زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ سارا قصہ صاف صاف سناؤ۔''

توتے نے کہا ''سنیے بندہ پرور! میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ پریشان ہوں اور سفر کی تکلیفیں برداشت کریں کیونکہ دور دراز کے سفر میں جان اور مال دونوں جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ مگر آپ نہ مانے۔ خیر تو سنیے۔ یہاں سے شمال کی طرف آپ کو تقریباً ایک سال تک برابر سفر کرنا پڑے گا تب کہیں ایک ایسا ملک ملے گا زرنگار۔ ایسا خوبصورت کہ کسی نے خواب و خیال میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔ اس کے مکان اور گلی کوچے ایسے کہ دیکھو تو عقل دنگ رہ جائے۔ اس ملک کے رہنے والے ایسے خوب صورت کہ چودھویں کا چاند انھیں دیکھ کے ایسا شرماتا ہے کہ غم سے گھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ وہاں کی شہزادی ہے انجمن آرا۔ میری کیا مجال کہ اس کے حسن کی تعریف کر سکوں۔ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ سات سو کنیزیں سونے کے پٹکوں سے کمر کسے اور جڑاؤ تاج سروں پر دھرے دن رات ان کی خدمت میں رہتی ہیں۔ ان کنیزوں کی لونڈیوں میں سے کسی کو شہزادی صاحبہ دیکھ لیں تو یقین ہے کہ شرم سے چلو بھر پانی میں ڈوب مریں۔''

توتے کا بیان سن کے ماہ طلعت سُن ہو گئی۔ سر جھکا لیا۔ جان عالم یہ سن کے پنجرا دیوان خانے میں لے آیا اور مفصل حالات پوچھنے لگا۔ توتے نے سمجھ لیا کہ جان عالم انجمن آرا کے حسن کا بیان سن کے دیکھے بغیر اس پر فدا ہو گیا ہے۔ توتے نے بہت چاہا کہ شہزادے کا دل ادھر سے ہٹ جائے اور وہ اس مصیبت میں مبتلا نہ ہو مگر قسمت میں تو جنگل جنگل کی خاک چھاننی لکھی تھی۔ کسی طرح باز نہ آیا۔

آخر توتے نے جان عالم سے کہا کہ "آپ کسی طرح نہیں مانتے تو میں آپ کو اس شرط پر لے چلوں گا کہ آپ میرا کہا مانیں۔ نہ مانیں گے تو دھوکا کھائیں گے اور پچھتائیں گے۔ پھر مجھ کو بھی جیتا نہ پائیں گے۔" شہزادے نے بھی طرح طرح کے وعدے کیے کہ "تو میرا ہمدرد ہے، تیرا ہر کہا مانوں گا اور تیری صلاح کے خلاف کچھ نہ کروں گا۔"

طے پایا کہ رات گزار لی جائے اور صبح کو روانگی ہو۔ مگر جان عالم کی آنکھوں میں نیند کہاں۔ کروٹیں بدل بدل کے رات کاٹی۔ دن نکلا تو شہزادے نے اپنے بچپن کے دوست اور ساتھی یعنی وزیرزادے کو یاد کیا۔ ملازموں کو حکم دیا کہ دو تیز رفتار ہوا سے باتیں کرنے والے گھوڑے سفر کے لیے تیار ہوں۔

گھوڑے تیار ہو گئے تو شہزادہ اور وزیرزادہ دونوں ضروری سامان ساتھ لے کے ان جانی منزل کے لیے چل نکلے۔

نہ سدھ بدھ کی لی او رنہ منگل کی لی
نکل شہر سے راہ جنگل کی لی

جان عالم کا سفر پر روانہ ہونا

توتے اور وزیرزادے کے ساتھ شہزادہ نازوں کا پالا محل سے نکل کے شہر پناہ کے دروازے پر پہنچا، مڑ کے شاہی محلوں اور شہر کی بستیوں کو دیکھا تو دل بھر آیا۔ عزیزوں اور دوستوں کی جدائی کے خیال نے بہت رلایا۔ خدا سے کامیابی کی دعا کر کے آگے بڑھا تو پنجرے کو کھول دیا۔ شہزادہ اور وزیرزادہ اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار تھے اور میاں مٹھو ہوا کے گھوڑے پر اڑے جاتے تھے۔ ہر منزل پر نیا دانہ کھاتے، نیا پانی پیتے اور خدا کا شکر کر کے آگے بڑھ جاتے۔

چلتے چلتے یہ قافلہ ایک عجیب جنگل میں جا نکلا۔ جنگل کیا ایک نرالا چمن تھا جس کا ہر تختہ پھولوں سے لدا تھا۔ پھول بھی ایسے رنگ برنگے کہ جی کو لبھاتے تھے اور ان کی بھینی بھینی خوشبو دل و دماغ کو تازہ کرتی تھی۔ شہزادہ خدا کی قدرت پر عش عش کرتا چلا جاتا تھا۔ اچانک ایک سمت سے دو تیز رفتار ہرن سامنے آئے۔ ان پر زربفت کی جھولیں پڑیں تھیں سینگوں پر جڑاؤ سنگوٹیا جڑی تھیں۔ گلے میں قیمتی ہیکلیں تھیں اور وہ چھم چھم کرتے قلانچیں بھرتے چلے جاتے تھے۔

جان عالم بے چین ہوا۔ وزیرزادے سے کہا "کسی طرح انھیں جیتا گرفتار کیجیے۔" دونوں نے ان کے پیچھے گھوڑے ڈال دیے۔ یا تو وہ ہرن اپنے انداز سے کھیلتے کودتے چلے جاتے تھے۔ گھوڑوں کو پیچھا کرتے دیکھا تو سنبھلے، کنوتیاں بدلیں اور چوکڑیاں بھرنے لگے۔ انھوں نے بھی گھوڑے ڈپٹائے۔ جہاں دیدہ پرند گھبرا کے پکارا۔ "ارے نادان! یہ کیا غضب کرتا ہے۔ کیا تو دیوانہ ہے، دیکھتا نہیں یہ جنگل نہیں جادو کا کارخانہ ہے۔" توتے نے ہر چند سر دھنا مگر کسی نے نہ سنا۔ وہ چلے گئے۔ یہ ہار کے ایک درخت پر بیٹھ رہا۔

دو چار کوس دونوں ہرن ساتھ ساتھ بھاگے پھر دونوں الگ الگ سمتوں کو ہو لیے۔ ایک کے پیچھے شہزادہ دوڑتا رہا اور دوسرے کے پیچھے وزیرزادہ۔ یوں دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ سورج غروب ہونے تک شہزادہ گھوڑا دوڑاتا رہا۔ اچانک ہرن نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ شہزادے نے گھبرا کے ادھر ادھر دیکھا۔ دور تک جنگل بیاباں، نہ توتے کا کہیں پتہ نہ وزیرزادے کا نشان۔ بہت گھبرایا۔ کہیں کوئی جان دار نظر نہ آیا۔

شہزادہ آگے بڑھا تو ایک چشمہ نظر آیا۔ گھوڑے سے اتر کے ہاتھ منہ دھویا اور خدا سے دعا کی کہ "اے بے کسوں کے مددگار، اے پاک پروردگار، اے بے سہاروں کو سہارا دینے والے، مصیبت کے ماروں کی بگڑی بنانے والے بس تیرا ہی آسرا ہے۔ میں نے تیرے بھروسے پر سلطنت کو خاک میں ملایا، گھر سے ہاتھ اٹھایا اور سفر کی تکلیفیں برداشت کیں۔"

دعا قبول ہوئی ایک بزرگ، خضر کی صورت، نورانی چہرہ، سفید داڑھی، سر پر سبز پگڑی بدن پر عنابی لباس، ہاتھ میں عصا لیے نمودار ہو گئے اور بلند آواز میں شہزادے سے سلام علیک کی۔ اس نے جواب دیا تو بزرگ نے پوچھا۔

"اے عزیز، تو کس پریشانی میں مبتلا ہے اور کیا چاہتا ہے۔ بیان کر۔"

شہزادہ یہ سن کر ایسا خوش ہوا کہ راستہ بھولنے کا غم بھی یاد نہ رہا۔ وزیرزادے اور توتے سے بچھڑنا بھی بھول گیا۔ بولا "آپ کو اس کی قسم ہے جس نے آپ کو میری رہبری کے لیے بھیجا ہے، جس کے لیے جی بے چین ہے اسے دکھائیے اور ملک زرنگار کا راستہ بتائیے؟

وہ بزرگ ہنسے کہ طلسم کے جنگل میں گرفتار ہے، ساتھی بچھڑ چکے، جان پر بن آئی ہے۔ مگر ملک زرنگار کو نہیں بھولا۔ لیکن اس کی حالت پر ترس بھی آیا۔ انھوں نے شہزادے سے کہا۔ "آنکھیں بند کرو۔" شہزادے نے آنکھیں بند کیں تو انجمن آرا سامنے تھی۔ سفر کی ساری تکلیف دور ہو گئی۔ پھر اس بزرگ نے شہزادے کو کچھ کھلا کے چشمے کے کنارے سلا دیا۔ صبح کو آنکھ کھلی تو اس مقام پر تھا جہاں سے راستہ بھولا تھا۔ اور ہرن کے پیچھے گھوڑا ڈالا تھا۔ سجدے میں گر پڑا اور خدا کا شکر ادا کیا۔

جان عالم نے پھر سے اپنا سفر شروع کیا۔ پتہ اس خضر صورت بزرگ سے پوچھ ہی لیا تھا۔ چلتے چلتے ایسے لق و دوق ریگستان میں جا پہنچا جہاں تپتی ریت کے سوا کچھ نہ تھا۔ پیاس سے زبان میں کانٹے پڑ گئے، مگر پانی ناپید تھا پریشانی کے عالم میں شہزادہ گھوڑا ادھر ادھر دوڑاتا تھا۔ اچانک گھنے درختوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ ذرا جان میں جان آئی۔ نزدیک جا کے دیکھا کہ صاف شفاف پانی کا ایک حوض لبالب بھرا ہوا ہے۔ آنکھوں نے لہروں سے ٹھنڈک پائی۔ گھوڑے سے اتر کے پانی پینے کو جھکا تو عجیب کرشمہ دیکھا۔ حوض میں انجمن

آرا نظر آئی۔ جان عالم کو دیکھ کے بولی" میں کب سے تیرے انتظار میں تھی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے تیری صورت دکھائی۔ اب کیا سوچ بچار ہے۔ بے دھڑک پانی میں کود پڑ اور جدائی کو ملاپ میں بدل دے۔" جان عالم نے ذرا بھی دیر نہ لگائی اور جھٹ پانی میں کود پڑا۔

کودتے ہی سر تلے، ٹانگیں اوپر۔ قلابازیاں کھاتا ذرا دیر میں تہہ کو جا لگا۔ آنکھ کھلی تو حوض تھا نہ انجمن آرا۔ دور تک بیابان نظر آیا۔ اب توتے کی بات یاد آئی اور سمجھا کہ یہ دوسری چوٹ کھائی۔

اب اس کے سوا کیا کر سکتا تھا کہ جدھر کو منہ اٹھے چل دے وہ چلتا رہا۔ چلتے چلتے ایک چار دیواری نظر آئی۔ پاس گیا تو دیکھا بڑا سا احاطہ ہے، اس کے اندر دور تک پھیلا باغ اور باغ کے بیچوں بیچ ایک شان دار عمارت۔ پھاٹک کھلا تھا۔ جان عالم دھوپ اور گرمی سے تنگ آ چکا تھا، کچھ سوچے بغیر اندر داخل ہوگیا۔ نرالی سج دھج کا باغ دیکھا، ہر طرف ہریالی تھی اور بل کھاتی ہوئی نہریں ادھر اُدھر بہتی تھیں۔ پیڑ مزے دار پھلوں سے اور پودے رنگ برنگ کے پھولوں سے لدے تھے۔ پیڑوں پر پرندے چہچہا رہے تھے۔ خوب صورت خادمائیں جھیلے لباس پہنے ادھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ جان عالم روشوں پر ٹہلتا ٹہلتا بارہ دری کے سامنے جا پہنچا دیکھا کہ بارہ دری کے آگے سنگ مرمر کا چبوترہ ہے۔ اس پر بادلے کا سائبان کھنچا ہے۔ بیچوں بیچ ایک خوب صورت مسند لگی ہے۔ جس پر ایک حسینہ عجیب ناز سے بیٹھی ہے۔ بیسیوں خواصیں خدمت کو حاضر ہیں۔ ان میں سے ایک خواص نے اسے دیکھ آواز دی۔" اے صاحب تم کون ہو؟ جان نہ پہچان، بے دھڑک پرائے مکان میں چلے آئے۔"

جان عالم تو پہلے ہی جینے سے تنگ اور مرنے کو تیار تھا۔ سیدھا گیا اور اس حسینہ کے برابر مسند پر جا بیٹھا۔ وہ تو پہلے ہی سے اس پر فریفتہ تھی۔ ہنس کے چپ ہو رہی۔ ذرا دیر رک کے پوچھا۔" آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟" شہزادہ بے چارہ کیا جواب دیتا وہ تو اس وقت ایک عجیب دنیا کی سیر میں مصروف تھا۔ سامنے جتنے پیڑ تھے سب پر دار جانوروں کی طرح کے تھے اور پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ جس درخت کا میوہ کھانے کو جی چاہتا وہ سامنے آ موجود ہوتا اور ناچنے لگتا۔ پھل آپ سے آپ منہ میں پہنچ جاتا اور درخت پھر اپنی جگہ کھڑا ہو جاتا۔ پھر مزہ یہ کہ اس کا کوئی پھل کم نہ ہوتا۔

خواصیں پھل کھا کھا کے یہ سارے تماشے دکھاتی تھیں۔ بلکہ تماشہ کیا دکھاتی تھیں، شہزادے کو ڈراتی تھیں کہ دیکھ لے یہ جادو کی نگری ہے، یہاں سے بچ نکلنا دشوار ہے۔ خیریت اسی میں ہے کہ جو کہا جائے بے چوں چرا کرو۔ شہزادہ سمجھ گیا کہ یہ جادو کا کارخانہ ہے، اب اللہ ہی نکالے تو یہاں سے نکلیں گے۔

وہاں شہزادے کی بڑی خاطر تواضع ہوئی۔ اس نے بھی یہی بہتر سمجھا کہ انکار نہ کرے۔ یہ محفل ختم ہوئی تو وہ جان عالم کو بارہ دری میں لے گئی، مسہری پر بٹھایا اور بولی۔" تو نے سنا ہوگا کہ شہپال جادوگروں کا بادشاہ ہے۔ میں اسی کی بیٹی ہوں۔ یہ باغ بلکہ اس کے چاروں طرف کا علاقہ جادو کا بنا ہوا ہے۔ میں ایک مدت سے تجھ پر فریفتہ تھی۔ میرے دیوتاؤں نے آج میری سن لی اور تجھے یہاں پہنچا دیا۔ انجمن آرا کی ملاقات کے سوا تو جو کچھ حکم دے گا بجا لاؤں گی۔"

شہزادہ بولا۔" جو کچھ تو نے کہا سچ ہے۔ تیری گفتگو سے پتہ چلا کہ تو بھی محبت کا زخم کھا چکی ہے۔ ذرا دل میں سوچ میں جس پر فریفتہ ہوں تو اسی کی جانی دشمن ہے۔ دشمنوں کی تین قسمیں بتائی جاتی ہیں۔ پہلا تو وہ اپنا دشمن ہو، دوسرا وہ جو دشمن کا دوست ہو اور تیسرا وہ جو دوست کا دشمن ہو۔ یہ تیسرا دشمن سب سے برا ہوتا ہے۔ انجمن آرا کی جدائی میں اپنا تو یہ حال ہے کہ تخت و تاج چھوٹا۔ گھر بار چھوٹا، دوست اور عزیز چھوٹے۔ عیش و آرام کی جگہ در در کی ٹھوکریں کھائیں۔ جس کے لیے یہ حال ہوا تو اسی کی دشمن ہے۔ اب تو ہی بتا میں تیری دوستی پر کیسے بھروسہ کروں؟"

یہ سن کے وہ آگ بگولا ہوگئی۔ غصے سے تھر تھر کانپنے لگی۔ بولی۔" میں جادوگروں کے بادشاہ کی بیٹی ہوں۔ ملک زرنگار میرے لیے ایک قدم کے فاصلے پر ہے۔ ابھی جاتی ہوں اور پلک جھپکتے انجمن آرا کو یہاں لے آتی ہوں۔ تیرے سامنے اسے جلا کے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کروں گی۔"

جان عالم یہ سن کے بدحواس ہوگیا۔ دل میں سوچا عورت کا غصہ برا ہوتا ہے۔ کیا عجب جو کچھ کہتی ہے ابھی کر دکھائے۔ انجمن آرا نہ رہی تو پھر رہ کیا جائے گا۔ مصلحت اسی میں ہے کہ کسی طرح اسے راضی رکھو۔ خدا بگڑے کاموں کو بناتا ہے۔ ممکن ہے آئندہ کوئی صورت نکل آئے۔ یہ سوچ کے اس سے جھوٹ سچ باتیں کیں اور جھوٹے دل سے محبت جتائی۔ وہ تو مطمئن ہو کے آرام سے سوگئی مگر شہزادے کی آنکھوں میں نیند کہاں۔ ساری رات یہ شعر زبان پر رہے۔

کسی کی شب وصل سوتے کٹے ہے
کسی کی شب ہجر روتے کٹے ہے
ہماری یہ شب کیسی شب ہے الٰہی
نہ سوتے کٹے ہے نہ روتے کٹے ہے

غرض کسی طرح صبح ہوئی۔ ناشتے کے بعد وہ جادوگرنی جان عالم سے بولی۔" میرا طریقہ یہ ہے کہ اس وقت سے پہر دن رہے تک شہپال کے دربار میں حاضر رہتی ہوں۔ تیری اجازت پاؤں تو جاؤں۔" جان عالم یہ سن کے دل ہی دل میں بہت خوش ہوا کہ خس کم جہاں پاک۔ ذرا دیر کو تو تیری منحوس صورت دیکھنے سے بچوں گا۔ مگر اسے بے وقوف بنانے کو بولا کہ" تیری جدائی پل بھر کو گوارا نہیں۔ خیر مجبوری ہے تو جا مگر جتنی جلدی بن پڑے لوٹ آئیو۔"

جان عالم کی زبان سے یہ باتیں سن کر جادوگرنی خوش ہوگئی۔ اس کے جانے کے بعد جان عالم اپنی قسمت کو روتا رہا اور اپنے کیے پر کڑھتا رہا کہ میں نے کیوں نادانی سے کام لیا اور کیوں حوض میں کودا۔ یہ نہ جانا کہ یہ سب جادو ہے۔ چھ گھڑی دن رہے وہ مکار عورت لوٹ آئی اسے دیکھ کر شہزادے کو رونا آیا مگر دکھانے کو ہنس دیا۔

دو مہینے اسی طرح بیت گئے۔ اس قید میں جان عالم کا یہ حال ہوا کہ سوکھ کے کانٹا ہوگیا۔ ایک دن وہ جادوگرنی رخصت ہوتے وقت جان عالم سے بولی۔ ''تیری تنہائی کا مجھے بڑا خیال رہتا ہے بلکہ بڑا ملال رہتا ہے۔ تو اکیلا تمام دن گھبراتا ہوگا۔ باغ کاٹے کھاتا ہوگا۔ کیا کروں۔ لاچار ہوں۔ ایسا کوئی نہیں جسے تیرا جی بہلانے کو چھوڑ جاؤں۔ یہ خواصیں ہیں مگر انھیں اٹھنے بیٹھنے بولنے چالنے کی تمیز نہیں۔ ان کی موجودگی سے تو اور گھبرائے گا۔

شہزادے نے کہا۔ ''ہم کیا گھبرائیں گے۔ تنہا پیدا ہوئے۔ تمام عمر اکیلے رہے۔ ہماری قسمت میں دوسرا لکھا نہیں۔ لیکن ہر دم یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ ہمیں تنہا پا کے کوئی مار ڈالے تو کیا ہو۔ ایسے مارے گئے کہ کوئی رونے والا بھی نہیں ہوگا۔ جب تک تجھے خبر ہو ہمارا تو کام تمام ہو چکے گا۔''

وہ بولی۔ ''یہ کیا بات تیرے خیال میں آئی۔ جانتا نہیں یہ طلسم کا مکان ہے، یہاں کب کسی کے گزر کا امکان ہے۔''

شہزادہ بولا۔ ''واہ! اگر کوئی جادوگر ہی مار ڈالنے پر کمر کس لے تو بھلا اسے کون روکے گا؟''

یہ سن کے تو اسے برے برے خیال آئے۔ جی جان سے جان عالم پر فریفتہ تھی۔ کھٹکا ہوا کہیں ایسا نہ ہو میرے پیچھے کوئی جادوگرنی ادھر سے گزرے اور شہزادے پہ عاشق ہوجائے اور اسے اڑا لے جائے پھر اپنی قید میں رکھے اور زندگی بھر نہ چھوڑے۔ وہ دیوانی محبت میں اندھی ہوگئی۔ یہ بھی نہ سوچا کیا انجام ہوگا جھٹ صندوق کھول وہ تعویذ نکالا جسے نقش سلیمانی کہتے ہیں اور شہزادے کے بازو پر باندھ کر بولی'' لے اب نہ جادو کا اثر ہو، نہ دیو کا گزر ہو اور نہ پری سے ضرر ہو۔ دل کا کھٹکا مٹا، مزے اڑا۔''

یہ کہہ کے وہ ساحرہ تو روز کی طرح شہپال کے دربار کو روانہ ہوئی اور جان عالم انجمن آرا کے خیالوں میں کھو گیا۔ روز کا یہی طریقہ تھا۔ ادھر جان عالم کے دل میں نیا خیال آیا کہ وہ اس نقش کی بہت تعریفیں کرتی تھی، کھول کے تو دیکھو، ممکن ہے اس میں رہائی کی کوئی تدبیر لکھی ہو۔

غرض جان عالم نے وہ نقش کھول کے دیکھا، بہت سے خانے بنے تھے۔ ان میں اسمائے الٰہی لکھے ہوئے تھے اور ان کی تاثیر کا بھی ذکر تھا۔ ایک خانے پر نظر پڑی۔ لکھا تھا ''کوئی شخص کسی جادوگر کی قید میں پھنسا ہو تو یہ اسم پڑھے نجات پائے گا یا طلسم کے مکان میں گھرا ہوا ہو، اسے پڑھتا جدھر چاہے چلا جائے اور جو کوئی جادو کرتا ہو، اس پر دم کر کے پھونک دے، اسی دم اس کی برکت جادوگر کو پھونک دے۔''

نقش میں رہائی کی تدبیر نظر آئی تو شہزادے کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ جلدی جلدی وہ اسم یاد کیا اور نقش کو تہہ کر کے پھر اسی طرح بازو پر باندھ دیا۔ اتنی دیر میں وہ جادوگرنی بھی آموجود ہوئی۔ جان عالم کے تیور بدلے دیکھے پوچھا۔ ''آج کیسا مزاج ہے؟''

شہزادے نے جواب دیا ''خدا کا شکر بہت اچھا ہے، میں بہت دیر سے تیرا انتظار کر رہا تھا۔ لے تجھے شیطان کے حوالے کیا، ہمارا اللہ نگہبان ہے۔''

جادوگرنی نے یہ الفاظ سنے تو ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ سمجھ گئی کہ آج کھیل بگڑ گیا۔ اور جان عالم ہاتھ سے نکلا۔ جادو کے زور سے روکنے کی کوشش کی۔ اثر نہ ہوا۔ جھنجھلا کے ناریل زمین پہ مارا۔ وہ پھٹا تو ہزاروں اژدہے منہ پھاڑے آگ اگلتے اس میں سے نکلے۔ شہزادے نے کچھ پڑھا، وہ سب پانی ہو کے بہہ گئے۔ اب تو وہ خوشامدوں پر اتر آئی۔ پاؤں پر سر دھرنے لگی۔ اس کی مدد کو جو اور جادوگرنیاں آ پہنچی تھیں وہ بھی شہزادے کو سمجھانے لگیں کہ جو جی جان سے فدا ہو اس کا ساتھ چھوڑنا اور اس سے دغا کرنا مناسب نہیں۔

شہزادے نے کہا۔ ''ذرا گریبان میں منہ ڈالو۔ ہم بھی تو کسی کی محبت میں عیش و آرام چھوڑ کے مصیبت جھیلنے کو نکلے تھے۔ تم نے ہمیں زبردستی قید کیا اور اس تک نہ جانے دیا جس کے لیے جی بے چین ہے۔ یہ احسان کچھ کم ہے کہ ہم نے تمھارا طلسم درہم برہم نہ کیا؟''

وہ سمجھ گئی دام سے چھوٹا پنچھی اب رکنے والا نہیں۔ وہ سر پٹختی رہ گئی اور یہ اسم الٰہی کی برکت سے رہا ہوا۔ سچ ہے اللہ کے نام میں بڑی طاقت ہے۔

شہزادے نے قید سے چھوٹ کے اپنی راہ لی۔ چلتے چلتے اس حوض پر پہنچا جس میں ڈبکی لگا کے اس آفت میں پھنسا تھا۔ وہاں اپنے گھوڑے کی لاش پڑی دیکھی۔ وہ بے چارہ ایسا وفادار تھا کہ پتھر سے سر مار کے مر گیا تھا۔ ایک تو وفادار ساتھی کے بچھڑنے کا غم دوسرے یہ خیال کہ اب پیدل چلنے کی مصیبت اور پڑی۔ جان عالم کو جتنا بھی دکھ ہوتا کم تھا۔ مگر ہمت نہ ہاری اور پیدل ہی اپنی منزل کی طرف چل دیا۔

ملکہ مہر نگار سے جانِ عالم کی ملاقات

شہزادہ سفر کرتے کرتے ایک ایسے جنگل میں جا پہنچا جس کی بہار چمن کو شرمندہ کرتی تھی۔ درخت ہرے بھرے میووں سے لدے تھے۔ پودوں پر رنگ برنگے پھول کھلے تھے۔ روشوں کے دونوں طرف پانی کی نہریں بہتی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا تھکے ہارے مسافر کو آرام پہنچاتی تھی۔ جی میں یہ بات آئی کہ آج کی

رات یہیں بسر کرنی چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ خدا کیا کرتا ہے۔

ایک طرف زمین ہموار تھی اور درخت گھنے تھے، پاس ہی صاف شفاف پانی کا چشمہ بہتا تھا۔ یہ اس کے کنارے جا بیٹھا۔ جنگل کی کیفیت جی کو بے چین کرنے والی تھی۔ درختوں پر پرند چہچہاتے تھے۔ جانور خوشی سے کلیلیں کرتے تھے۔ آسمان پر بادل تیرتے تھے۔ کہیں سرخ کہیں سفید، کہیں اودے، بادل گرجتے تھے۔ بجلی چمکتی تھی۔ سامنے مور ناچ رہے تھے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ آسمان میں شفق پھولی تھی۔ رنگ برنگی دھنک نے منظر کو اور دل کش بنا دیا تھا۔

قاعدہ ہے کہ موسم سہانا ہوتا ہے اور عیش کے سامان موجود ہوتے ہیں تو وہ جسے جی پیار کرتا ہے، زیادہ یاد آتا ہے۔ اس وقت جان عالم کو انجمن آرا کی یاد آئی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

جان عالم اپنے خیالوں میں گم تھا کہ سامنے سے عورتوں کا ایک غول آتا دکھائی دیا۔ یہ دھوکا کھا چکا تھا سنبھل کر بیٹھ گیا اور کچھ پڑھنے لگا۔ مثل مشہور ہے کہ دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ جب وہ نزدیک آئیں تو غور سے دیکھا۔ کوئی چار پانچ سو لڑکیاں تھیں، سب کی سب پری زاد اور نازک بدن، ایک سے ایک شوخ طرار۔ اچھلتی کودتی چلی آتی تھیں۔ بیچ میں ہوادار پر ایک حسینہ سوار تھی۔ سر پر سنہری تاج تھا اور بدن میں بھڑکیلا لباس تھا۔ چقماقی بندوق پاس دھری تھی۔ صاف ظاہر ہے شکار کھیلتی چلی آتی ہے۔

جو لڑکیاں آگے آگے چلی آتی تھیں، ان کی جان عالم پر نگاہ پڑی۔ سب کی سب لڑکھڑا کر ٹھٹک گئیں کچھ سکتے کے عالم میں سہم کر جھجک گئیں۔ کچھ بولیں۔ ''ان درختوں سے چاند نے کھیت کیا ہے۔'' کچھ بولیں۔ ''نہیں ری سورج چھپتا ہے۔'' کسی نے کہا۔ ''غور سے دیکھ ماہ ہے۔'' ایک جھانک کے بولی۔ ''واللہ ہے۔'' ایک نے کہا۔ ''چاند ہے۔'' تو دوسری نے کہا۔ ''تارا ہے۔'' کوئی بولی۔ ''پری زاد ہے۔'' کسی نے کہا۔ ''خدا جانے قدرت کا راز ہے۔''

ملکہ نے جو لڑکیوں کی کھسر پسر سنی تو بولی۔ ''خیر ہے؟''

خواصوں نے ہاتھ جوڑ کے عرض کی۔ ''قربان جائیں، جان کی امان پائیں تو زبان پر لائیں۔ حضور کی سواری ہمیشہ ادھر سے جاتی ہے مگر آج یہاں عجب تماشہ ہے۔ درختوں میں ایک چاند سی شکل نظر آتی ہے۔''

ملکہ نے حیرت سے پوچھا۔ ''کہاں؟''

ایک نے عرض کی۔ ''وہ حضور کے سامنے۔''

جیسے ہی ملکہ کی نظر جان عالم کے چہرے پر پڑی ہوش جاتے رہے۔ ایسا حسین پہلے کا ہے کو دیکھا تھا۔ چہرے کا رنگ روپ اور ایک ایک نقش جان لیوا تھا۔ ملکہ تھرتھرا کر ہوادار پر غش ہوئی۔ خواصوں نے چہرے پر گلاب اور کیوڑہ چھڑکا۔ کوئی نادعلی پڑھنے لگی۔ کوئی سورہ یوسف دم کرنے لگی۔ کسی نے بازو پر رومال باندھا۔ کوئی تلوے سہلانے لگی۔ کوئی مٹی پر عطر چھڑک کر سنگھانے لگی۔ کوئی ہاتھ منہ کیوڑے سے دھوتی تھی۔ کوئی صدقے ہو ہو کے روتی تھی۔ کسی نے کہا۔ ''بری روح کا اثر ہے۔'' کسی نے کہا۔ ''یہ سب عشق کا کرشمہ ہے۔''

بڑی دیر میں شہزادی کو ہوش آیا۔ دل مگر اسی صورت میں اٹکا تھا۔ خواصوں میں صلاح ہوئی کہ اب ادھر سے سواری پھیرو اور ملکہ کو گھیرے میں لے لو۔ ملکہ بولی۔ ''کیا تم سب دیوانی ہو۔ یہ کوئی مسافر بے چارہ غربت کا مارا ہے۔ تھک کر یہاں بیٹھ رہا ہے۔ اس سے کیا ڈرنا۔ چلو اسے نزدیک سے دیکھیں۔''

خواصیں بے چاری کیا کرتیں۔ حکم کے آگے لاچار تھیں۔ آگے بڑھیں مگر جھجکتی تھیں اور ایک دوسرے کا منہ تکتی تھیں۔ جوں جوں سواری آگے بڑھتی تھی ملکہ کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی تھی۔

یہ ملکہ مہر نگار تھی اور اس کے حسن کا دور دور جواب نہ تھا۔ جان عالم نے ملکہ کو دیکھا تو اس کی حالت بھی غیر ہوئی مگر ضبط سے کام لیا اور جس طرح بیٹھا تھا اسی طرح اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ ذرا بھی ہلا جلا نہیں۔

ملکہ کا اشارہ پا کے خواص آگے بڑھی۔ پوچھا۔ ''کیوں جی میاں مسافر، تمھارا کدھر سے آنا ہوا اور کیا مصیبت پڑی ہے جو اکیلے اس جنگل میں وارد ہو؟''

شہزادے نے مسکرا کے کہا۔ ''مصیبت تجھ پر پڑی ہوگی۔ تیری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں مصیبت کے مارے آتے ہیں۔ تم سب بتاؤ کہ تم پر کیا کمبختی آئی کہ چڑیلوں کی طرح شام کو جنگل میں منڈلاتی پھرتی ہو۔''

ملکہ یہ جواب سن کے پھڑک گئی۔ خود بولی۔ ''واہ صاحب واہ، تم تو بڑے گرم مزاج ہو، حال پوچھنے پر اتنے خفا ہوئے کہ ایسی سخت بات کہی اور سب کو چڑیلیں ٹھہرایا۔''

جان عالم نے جواب دیا۔ ''ہمارا یہ طریقہ نہیں کہ اجنبی لوگوں سے یوں بے تکلف بات کریں۔''

ملکہ پھر بولی۔ ''حضور! میں تو آپ سے صرف یہ پوچھتی ہوں کہ آپ کا کیا نام ہے اور کس طرف سے ادھر آنا ہوا؟''

شہزادہ بولا۔ ''حضور تو آپ ہیں کہ جیتے جی چار کے کندھے پر چڑھی ہیں۔ ہم غریبوں کا کیا ہے؟''

خواصوں نے ادب سے عرض کیا کہ سرکار اس اجنبی مرد کے منہ نہ لگیں۔ بڑا منہ پھٹ آدمی معلوم ہوتا ہے۔

ملکہ نے کہا۔ ''تم سب چپ رہو۔ خواہ مخواہ بیچ میں دخل نہ دو۔ بگڑا تو پتہ نہیں کیا تمھاری درگت بنائے۔'' یہ سن کے وہ سب الگ ہٹ گئیں اور ایک دوسرے سے کہنے لگیں۔ ''خدا خیر کرے۔ عجب بے ڈھب آدمی سے پالا پڑا ہے۔''

ملکہ پھر شہزادے سے مخاطب ہوئی۔ ''اے صاحب، کچھ منہ سے بولو، سر سے کھیلو۔''

جان عالم نے جواب دیا۔ ''ذرا دیر کو اپنی بادشاہی بھولو اور ہوا کے گھوڑے سے اتر کے ہم فقیروں کے پاس بیٹھو۔ طبیعت حاضر ہوگی تو ہم بھی کچھ بولیں گے۔''

ملکہ بولی۔ ''تم بھی خوب چیز ہو، حال فقیروں کا، دماغ امیروں کے، باتیں کڑوی کسیلی، خیر تمھاری خوشی اسی میں ہے تو ہم ہوادار سے اترتے ہیں۔''
یہ کہہ کے اتری اور جان عالم کے برابر بیٹھ گئی۔

خواصوں نے جو یہ دیکھا تو دانتوں میں انگلیاں دبالیں۔ سب کو حیرت کہ یہ کیا ہوگیا؟ ایک بولی۔ ''بی بی! یہ انسان ہے یا جادوگر، کیسی بدزبانی کی پھر بھی پری ملکہ کو شیشے میں اتار لیا۔ بیٹھے بٹھائے میدان مار لیا۔ دوسری بولی۔ ''تجھے اپنے دیدوں کی قسم، سچ بولیو، ایسا جوان، رنگیلا، سج دار، طرار، آفت کا پرکالہ، دنیا سے نرالا تو نے یا تیری ملکہ نے کبھی دیکھا تھا۔ اری دیوانی خوب صورتی عجب چیز ہے، حسن سارے جہاں کو عزیز ہے۔'' غرض سب اپنی اپنی کہتی تھیں۔

جب ملکہ ہوادار سے اتر کے شہزادے کے پاس بیٹھی تو ذرا دیر تو وہ چپ رہا پھر ٹھنڈی سانس بھر کے یہ شعر پڑھا۔

سراسر دل دکھاتا ہے کوئی ذکر اور ہی چھیڑو
پتہ خانہ بدوشوں سے نہ پوچھو آشیانے کا

شعر پڑھ کے بولا۔ ''صاحب! ہمارا حال جان کے کیا کروگی۔ مختصر یہ ہے کہ بے یار و مددگار ہیں، مصیبتوں میں گرفتار ہیں۔ گھر سے دور ہیں اور آرام و آسائش سے محروم۔ پیروں میں چلنے کی طاقت نہیں مگر منزل کی تلاش میں پریشان ہیں۔

ظاہر میں گرچہ بیٹھا لوگوں کے درمیاں ہوں
پر یہ خبر نہیں ہے میں کون ہوں کہاں ہوں
اے ساکنانِ دنیا! آرام دوگے اک شب
بچھڑا ہوں دوستوں سے، گم کردہ کارواں ہوں

یہ اشعار پڑھ کے وہ تو چپ ہو رہا مگر ملکہ سمجھ گئی کہ ہو نہ ہو کسی ملک کا شہزادہ ہے مگر کسی کے عشق میں دیوانہ ہوگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو بات ہے اس کا دل پر اثر ہوتا ہے۔ سوچا کسی تدبیر سے اسے گھر لے چلو، ایک دن سارا حال معلوم ہو جائے گا۔ کہاں تک چھپائے گا۔ بڑی خوشامد سے بولی۔ ''اے عزیز! یہ علاقہ ہماری سلطنت میں شامل ہے، تم زمانے کی گردش سے مسافر بن کے یہاں آنکلے ہو۔ تمھاری مہمانی ہم پر فرض ہے۔ یہاں تک آگئے ہو تو دو چار قدم اور سہی۔ غریب خانہ قریب ہے۔ آج کی رات وہاں آرام کرو۔ صبح تم کو اختیار ہے۔ چاہے رہو چاہے سفر پر روانہ ہو۔''

جان عالم نے تیوری چڑھا کے کہا۔ ''دیکھیے آپ نے پھر اپنی سلطنت کا رعب ڈالا۔ مانا آپ تخت و تاج کی مالک ہیں۔ یہ ملک آپ کا ہے۔ ہم غریب فقیر پردیسی ہیں مگر ایسے بھوکے بھی نہیں کہ آپ کے کھانے کے محتاج ہوں۔ اپنی طبیعت اپنے اختیار میں نہیں۔ کسی کی مہمان داری اور تواضع گوارا نہیں۔''

ملکہ کو جان عالم کے انکار سے تکلیف پہنچی۔ کہنے لگی ''کسی کی دعوت نامنظور کرنا کوئی اچھی بات نہیں۔ آگے آپ کو اختیار ہے۔ ہم آپ کو مجبور تو کر نہیں سکتے۔''

جان عالم نے سوچا کسی کا دل توڑنا اچھی بات نہیں۔ پھر یہ کہ گھر سے نکلے مدتیں ہوگئیں۔ آدمی کی صحبت میسر نہ آئی۔ یہ بھی تو شہزادی ہے۔ ذرا دیر اس سے ہنس بول کے اپنا غم غلط کرو۔ اٹھا اور ملکہ کے ساتھ ہولیا۔ سارے راستے دل چسپ گفتگو کرتا رہا۔ ملکہ پہلے ہی فریفتہ ہو چکی تھی، شہزادے کی گفتگو نے اور بھی دل موہ لیا مگر دل ہی دل میں افسوس کرتی تھی کہ ایسے میں جی اٹکا ہے جو کسی اور پر فدا ہے۔ ڈرتی تھی کہ جو کچھ ہوا اس کا انجام اچھا ہوتا نظر نہیں آتا۔

دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہنستے بولتے باغ کے دروازے پر آپہنچے۔ دروازہ کھلا۔ دونوں اندر آئے۔ باغ ایسا کہ جس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ قلم حیران ہے۔ جس ملک کا جنگل چمن سے بہتر ہو، وہاں کے باغ کا کیا کہنا۔ دور تک پھیلا ہوا احاطہ۔ چاروں کونوں پر چار بنگلے۔ ہر طرف نرم نرم سبزے کا قالین بچھا۔ بیچ بیچ میں طرح طرح کے پھولوں کی کیاریاں، جگہ جگہ گل مہندی کی بہار، گل عباسی سے خدا کی شان نظر آتی تھی۔ نرگس کے پھول ایسے دکھائی دے رہے تھے جیسے کسی کے انتظار میں ہوں، گل شبو سے بھینی بھینی مہک آتی تھی۔ میوہ دار درخت الگ بہار دکھاتے تھے۔ پھلوں کے بوجھ سے ٹہنیاں زمین چوم رہی تھیں۔ روشیں ہموار اور خوش نما۔ ان کے دونوں طرف صاف شفاف پانی کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ بیلا، چنبیلی، موتیا، موگرا، بدن بان، جوہی، کیتکی، کیوڑا، نسرین اور نسترن اپنی اپنی خوشبو اور رنگ روپ سے سیر کرنے والے مست کرتے تھے، فاختائیں اور قمریاں شاخوں پر جھولتی اور چہچہاتی تھیں، مور ناچ ناچ کے دعوت نظارہ دیتے تھے۔ قازیں نہروں میں تیری پھرتی تھیں۔ غلام اور کنیزیں باغ کی صفائی میں مشغول تھے۔

باغ کے بیچ میں ایک خوب صورت سی بارہ دری تھی۔ یہاں ہر کمرہ سجا ہوا تھا۔ غلام گردش کے آگے سنگ مرمر کا چبوترہ، چبوترے کے اوپر شامیانہ لگا ہوا تھا۔ اس کی جھالر سفید بادلے کی تھی۔ ڈوریاں کلابتوں کی تھیں۔ اس کے برابر میں صاف پانی کا حوض تھا۔ آسمان صاف تھا۔ چودھویں کا چاند ہر طرف روشنی بکھیر رہا تھا۔ برسات کی چاندنی یوں بھی قیامت ہوتی ہے۔ چاروں طرف فوارے جاری تھے۔ فوارے کے پانی میں بادلہ کتا پڑا تھا جو پانی کے ساتھ ہوا میں بلند ہوتا اور عجب چمک دمک دکھاتا تھا۔

ملکہ نے شہزادے کو لے جا کے مسند پر بٹھایا۔ حسین لڑکے لڑکیاں خشک میوؤں، تازہ پھلوں، طرح طرح کی مٹھائیوں اور لذیذ کھانوں کی سینیاں اور خوان لے لے کے دوڑے، شہزادے کی خوب تواضع ہوئی۔ پھر گانے بجانے کی محفل جمی۔ ایک سے ایک اچھا گانے بجانے والا وہاں موجود تھا۔ سماں بندھ گیا۔ حسینوں نے ایسے ایسے ناچ دکھائے اور گھنگھرو بجائے کہ سبحان اللہ۔

شہزادے کو خوش پایا تو ملکہ نے سوال کیا۔ ''اے عزیز! تمھیں خدا کی قسم، سچ کہو، کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو اور کس کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہو؟''

جان عالم نے مجبور ہو کے سب کچھ صاف صاف بتلا دیا۔ کہا۔'' ملکہ! میں شاہ فیروز بخت کا لڑکا ہوں۔ جان عالم میرا نام ہے۔ ملک ختن کا رہنے والا ہوں۔ فسحت آباد ہماری سلطنت کا صدر مقام ہے۔ میں نے ایک توتا مول لیا تھا۔ جو ایسی ایسی باتیں سناتا تھا کہ سننے والے کی عقل دنگ ہو۔ اس کی زبان سے انجمن آرا کے حسن کا قصہ سنا۔ دل بے قرار ہوگیا۔ گھربار چھوڑا اور اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ پھر وزیرزادے اور توتے سے بچھڑے، طلسم میں گرفتار ہوئے، جادوگرنی سے نقش سلیمانی پانے اور رہا ہونے کا قصہ سنایا اور بتایا کہ اب میں جلد سے جلد ملک زرنگار پہنچنا چاہتا ہوں۔

ملکہ نے جو یہ قصہ سنا بہت اداس ہوئی۔ وہ خود شہزادے کو چاہنے لگی تھی مگر تھوڑا بہت اندازہ اس کا بھی تھا کہ یہ کسی اور پر مائل ہے۔ اب ساری بات خود اس کی زبان سے سن لی تو بالکل مایوس ہوگئی اور آہیں بھرنے لگی۔

شہزادے نے پوچھا۔'' کیا بات خیر تو ہے؟'' جواب میں ملکہ نے اپنے دل کی بات کہہ سنائی کہ تم کسی اور پر فدا ہو اور ہم تم پر شیدا ہیں۔ عجب بات ہے کہ جو ہمارے دل کا علاج کرسکتا ہے وہ خود بیمار اور کسی اور کا محتاج ہے۔

شہزادے نے دلاسا دیا کہ۔'' غم نہ کرو، ہم کسی طرح باہر نہیں، جو تمھارا حکم ہوگا بجالائیں گے مگر جس کام کو پہلے نکلا ہوں۔ اسے پہلے پورا کروں گا۔'' جان عالم نے بہت تسلیاں دیں تو ملکہ کے دل سے غم دور ہوا۔

باتوں میں وقت کا پتہ نہ چلا۔ اب صبح ہونے کو تھی۔ شہزادہ سفر کے لیے تیار ہوا۔ ملکہ کو بے حساب ملال ہوا مگر روک بھی نہ سکتی تھی۔ بولی۔'' باپ میرا بھی شہنشاہ تھا۔ بہت سے تاج دار خراج دیتے تھے۔ مگر ان کی عادت میں شروع سے درویشی تھی۔ تخت و تاج چھوڑا، دنیا سے منہ موڑا، شہر چھوڑ کے اس ویرانے کو آباد کیا اور یہاں مکان بنا کے خدا کی یاد میں بیٹھ رہے۔ مجھ سے بہت کہا کہ کہیں شادی کرلو۔ مگر مجھے اپنے باپ کی جدائی گوارہ نہ ہوئی۔ اب یہ نئی آفت آئی کہ ایک پردیسی پنچھی پہ جی فدا ہوگیا۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ اگر کوئی ہرج نہ ہو تو چلتے وقت میرے والد سے ملاقات کرتے جاؤ۔''

جان عالم نے کہا بہتر ہے۔ ایک خواص کے ساتھ یہ بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دیکھا کہ نورانی صورت ایک بزرگ بوریا بچھائے یادِ خدا میں مصروف ہے۔ شہزادے نے سلام عرض کیا۔ اس نے دعا دے کر ہاتھ بڑھایا اور گلے سے لگا لیا۔ محبت سے پاس بٹھا کے بولا۔'' ملکہ کا سارا حال ہم پر ظاہر ہے۔ ہم نے کیسا کیسا سمجھایا مگر اس کی عقل میں کچھ نہ آیا۔ بڑے بول کا سر نیچا۔ اب کس کس طرح تمھاری منتیں کیں مگر تم شادی پر رضامند نہ ہوئے۔ خیر تم نے جو اس سے وعدہ کیا ہے اگر پورا کروگے تو اللہ تعالیٰ تمھیں اپنی عنایتوں سے سرفراز کرے گا۔ ہر انسان کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دل توڑنا سب سے بڑا گناہ ہے۔''

شہزادے نے سر جھکا کے عرض کیا کہ۔'' آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ میں بہت مجبور ہوں۔ جس ارادے سے گھر چھوڑا۔ شہر سے منہ موڑا۔ عزیزوں، دوستوں سے بچھڑا، اسے پورا نہ کروں گا تو اپنے پرائے طعنے دیں گے کہ کم ہمت تھا، راستے میں آرام ملا تو بیٹھ رہا۔ خوف سے منزل تک نہ پہنچ پایا۔ خواہ مخواہ عشق کا دم بھرتا تھا۔''

بزرگ نے فرمایا'' شاباس'' جیتے رہو۔ خدا تمھیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے جواں مردی اور ثابت قدمی اسی کا نام ہے۔ تمھارا حوصلہ دیکھ کے امید ہوتی ہے کہ مہرنگار سے جو وعدہ کیا ہے اسے بھی پورا کروگے۔''

اس گفتگو کے بعد بزرگ نے جان عالم کو ایک لوح عنایت کی۔ یہ بھی ایک طرح کا تعویذ تھا۔ اس نے سمجھایا کہ۔'' جب کبھی کوئی مصیبت پڑے اسے کھول کر دیکھ لینا اور جو فال نکلے اس پر عمل کرنا۔ اللہ تعالیٰ ہر مشکل آسان کردے گا۔ اچھا اب جاؤ۔ خدا حافظ، تمھارا اللہ نگہبان۔''

لوح لے کے شہزادہ ملکہ کے پاس آیا اور بولا۔'' تو اب ہم رخصت ہوتے ہیں۔ تمھیں خدا کو سونپے جاتے ہیں۔'' ملکہ نے چلنے کی بات سنی، کلیجہ تھام کے یہ شعر پڑھنے لگی۔

میں مرگئی سن اس کے سرانجام سفر کا
آغاز ہی دیکھا نہ کچھ انجام سفر کا
کہتے ہیں وہ اب جاتا ہے ایسی ہی دعا کر
مسدود ہو رستہ دل تا کام سفر کا
مت جان گئی مجھے، اے جان لیے چل
کرتی چلوں گی ساتھ ترے کام سفر کا
میں کشور ہستی ہی سے اب کوچ کروں گی
آگے نہ مرے لیجو تو نام سفر کا
چلنے کی صلاح اس کے ٹھہرتی نہیں اب ساتھ
موقوف نوازش ہوا آرام سفر کا

جس طرح پیٹھ دکھائے جاتے ہو اسی طرح ایک دن منہ دکھائیو کہ جدائی کا غم ہمارے دل سے دور ہو جائے۔'

غرض جان عالم روانہ ہوا۔ مہرنگار کا روتے روتے برا حال ہوگیا۔ سہیلیوں نے سمجھایا کہ۔'' مسافر کے پیچھے رونا بدشگونی ہے۔ اللہ وہ دن بھی دکھائے گا جب مسافر صحیح سلامت لوٹ کے آئے گا۔''

خود مہرنگار بھی اپنے دل کو طرح طرح تسلیاں دیتی تھیں وہ کسی قابو میں نہ آتا تھا۔ دل بے قرار تھا، آنسوؤں پر کسی طرح اختیار نہ تھا۔ ہر وقت جان عالم کی جدائی میں گھلتی تھی۔

(تلخیص و تسہیل: پروفیسر حنیف نقوی)

□□□

اقبال محی الدین

زراعت میں جنیٹکس کی اہمیت

اناج، پھلوں، پھولوں اور سبزیوں کی بہتر پیداوار اور ان کی عمدہ قسمیں پیدا کرنے میں جنیٹکس (Genetics) کا اہم کردار ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک پھل کے پودے کو دوسری قسم کے اسی نسل کے پودے سے کراس (Cross) کیا جائے تو نتیجے کے طور پر ایک بہترین قسم پیدا ہوسکتی ہے۔ گلاب کے پودے کو دوسرے گلاب کے پودے سے کراس کرنے سے ایک نئی قسم کا اچھا گلاب پیدا ہوسکتا ہے۔ سبزیوں اور اناج کے پودوں پر بھی اکثر تجربات ہوتے رہتے ہیں جن کے کراس کرنے سے نئی نسل پیدا ہوجاتی ہے۔ ان سب نئی قسموں کی پیداوار میں جنیٹکس کا بہت اہم رول ہوتا ہے۔ آج کل جنیٹکس کا تجربہ بڑی بڑی تجربہ گاہوں میں کیا جارہا ہے تاکہ اناج، پھل، پھول اور سبزیاں زیادہ اور عمدہ قسم کی ملیں جو ہماری بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو آسانی سے پوار کرسکیں۔ دہلی کا انڈین ایگری کلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (زرعی تحقیق ادارہ) اس کام کو بخوبی انجام دے رہا ہے۔ یہاں گیہوں، چاول، پھلوں اور سبزیوں کی ایسی قسمیں پیدا کی جارہی ہیں جو کم سے کم وقت میں تیار ہوجاتی ہیں۔ یہ سب کمال ہے ہماری سائنسی ترقیات کا اور ہمارے سائنس دانوں کا جو دن رات اپنی انتھک کوششوں سے جنیٹکس پر تجربات کرکے ہمارے لیے مددگار ثابت ہورہے ہیں۔

سب سے پہلے ہمیں پوسا انسٹی ٹیوٹ یا انڈین ایگری کلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے بارے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ کب قائم ہوا تھا اور اس کے قائم کرنے کا مقصد کیا تھا؟

1905 میں سب سے پہلے یہ انسٹی ٹیوٹ شمالی بہار کے پوسا نامی دیہات میں قائم کیا گیا تھا۔ لیکن 1926 میں اس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو دہلی منتقل کردیا گیا، کیونکہ ایسے انسٹی ٹیوٹ کی ضرورت بڑے شہر میں تھی۔ اس کا نام انڈین ایگری کلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ رکھا گیا۔ اس کو پوسا انسٹی ٹیوٹ، دہلی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ انڈین ایگری کلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ 1958 سے اپنی ڈگری بھی دیتا ہے۔ پھلوں، پھولوں، سبزیوں اور اناج کو بہتر بنانے کے لیے یہاں مستقل طور پر تحقیقی کام ہوتا رہتا ہے۔

انڈین ایگری کلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں کھیتی باڑی کو فروغ دینے کے لیے کھیتی کے ہر پہلو پر ریسرچ ہوتی ہے۔ یہاں بیس شعبوں میں الگ الگ پہلوؤں پر تحقیقی کام ہوتا رہتا ہے۔ ان شعبوں کے نام ہیں:

(1) سوائل سائنس اینڈ ایگری کلچرل کیمسٹری (Soil Science And Agricultural Chemistry)
(2) ایگری کلچرل کیمیکلس (Agricultural Chemicals)
(3) مائی کالوجی اینڈ پلانٹ پائی تھولوجی (Micology And Plant Pythology)
(4) اینٹومولوجی (Antomology)
(5) نیماٹولوجی (Nemotology)
(6) جنیٹکس (Genetics)
(7) سیڈ ٹیکنولوجی (Seed Technology)
(8) ہورٹی کلچر (Horticultural)
(9) ویجی ٹیبل کروپس (Vegetable Crops)
(10) فلوری کلچر (Floriculture)
(11) ایگری کلچرل فزکس (Agricultural Physics)
(12) مائی کرو بائی لوجی (Micro Biology)
(13) ایگری کلچرل اکنومکس (Agricultural Economics)
(14) ایگری کلچرل ایکسٹینشن (Agricultural Extension)
(15) بائیو کیمسٹری (Bio-Chemistry)
(16) پلانٹ فزی اولوجی (Plant Physiology)
(17) ایگرونومی (Agronomy)
(18) ایگری کلچرل انجینئرنگ (Agricultural Engineering)
(19) نیوکلیر ریسرچ لیباریٹری (Nuclear Research Laboratory)
(20) واٹر ٹیکنولوجی (Water Technology)

انڈین ایگری کلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے یہ سارے شعبہ جات پیڑ پودوں، پھل، پھول اور اناج کی عمدہ سے عمدہ قسمیں تیار کرنے کے تحقیقی کام میں منہمک رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ مٹی کی زرخیزی کو برقرار رکھنے اور صاف پانی پر بھی تجربات ہوتے رہتے ہیں۔

جنیٹکس (Genetics) کیا ہے اور اس کی پیڑ پودوں اور جانوروں کے سلسلے میں کیا اہمیت ہے؟

جنیٹکس ایک سائنس ہے جو یہ بتاتی ہے کہ کیوں نباتات وحیوانات ایک دوسرے سے ملتے جلتے یا مختلف ہوتے ہیں۔ جنیٹکس کے استعمال سے مخصوص قسم کے پودوں اور حیوانات کی قسمیں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ جنیٹکس کا ادویات کے سلسلے میں بہت اہم رول ہے۔ مثلاً مائی کروبس کی ایسی قسمیں پیدا کرلی گئی ہیں جو بہت زیادہ مقدار میں پینی سی لین (Penicillin) اور اسٹرپٹومائی سین (Straptomycin) مہیا کرتی ہیں جو بیماریوں کو روکنے میں معاون ثابت ہوئی ہیں۔

پوسا انسٹی ٹیوٹ کھیتی باڑی میں ترقی کے لیے دن رات کام کرتا رہتا ہے اور تقریباً ہر فصل کی اچھی قسمیں پیدا کرنے کے سلسلے میں تحقیقی کام یہاں ہوتا رہتا ہے۔ مٹی کی زرخیزی کو قائم رکھنے، پانی کے صحیح استعمال، پودوں اور پھلوں کی بیماریوں پر تحقیق کے علاوہ کھیتی کو نقصان پہنچانے والے کیڑے مکوڑوں پر بھی تجربات ہوتے رہتے ہیں۔

جنیٹکس کا انحصار ہائی بریڈ (HYBRID) پر ہے؟

ہائی بریڈ کیا ہے؟

ہم ہائی بریڈ کیوں بناتے ہیں؟ اور یہ کیسے پیدا کیے جاتے ہیں؟

ہائی بریڈ (HYBRID) ایک ہی Species کے دو جین کے اعتبار سے مختلف افراد کے کراس کا ماحصل ہے۔ تجربات کی ماحصل ہائی بریڈ بہتر نسل یا قسم ہوتی ہے جس میں طاقت بھی زیادہ ہوتی ہے اور اپنے والدین کے مقابلے میں وہ ہر طرح سے اعلا بھی ہوتے ہیں۔ جب دو پودوں کا کراس بریڈ (Cross Breed) کیا جاتا ہے تو نتیجے کے طور پر اچھی قسم کا پودا ملتا ہے۔ جیسے ہائی بریڈ مکا جو دو الگ الگ قسموں سے پیدا کی جاتی ہے۔

ایک سائنس داں جس کا نام کارپی چینکو تھا اس نے سرسوں اور مولی پر کچھ تجربات کیے تھے۔ اس نے دو Species کو کراس کر کے اور ہائی بریڈ کے کروموسومس (Chromosomes) کو دوگنا کر کے ایک نئی قسم کی فصل تیار کرنے کی کوشش کی اور یہ ثابت کردیا کہ تجربے کے طور پر ایک قسم جو قدرتی طور سے نہیں ملتی، پیدا کی جاسکتی ہے۔ اس تجربے کے لیے اس نے سرسوں اور مولی کو کراس کر کے ایک نئی قسم جس کو ریفانو براسیکا (Raphanobrasicca) کہتے ہیں، تیار کی۔ حالانکہ اس نئی قسم کے ذریعے کھیتی کے اعتبار سے کوئی نمایاں کامیابی نہیں ہوئی مگر سائنسی اعتبار سے یہ غیر معمولی تجربہ کامیاب رہا۔ ہندوستان میں رائی اور گیہوں کا کراس بنایا گیا جس کو سیکل (Secale) کہتے ہیں۔ سیکل میں کچھ قسم کی بیماریوں سے نجات پانے کے لیے قوتِ مدافعت بھی موجود ہے۔ ایسی جگہوں پر جہاں زمین ریتیلی ہو اور پانی کم دستیاب ہوتا ہو، سیکل کی کھیتی زیادہ فائدہ مند ثابت ہوسکتی ہے۔ سیکل کی کھیتی پہاڑی خطوں اور ٹھنڈے علاقوں میں خاص طور سے کی جاسکتی ہے۔

فصلوں کو بیماریوں سے بچانے میں جنیٹکس بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ بیماریوں کو روکنے کے لیے پودوں میں مخصوص جین ہوتے ہیں اور ان جین کو ایک قسم سے دوسری قسم میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح کسی بھی اچھی قسم میں بیماری کو روکنے والے جین منتقل کر کے پودوں کو بیماریوں سے بچایا جاسکتا ہے۔

ایک عام خیال ہے کہ کراس کرنے سے پیدا ہونے والے بیج اچھی قسموں کے نہیں ہوتے اور ان میں طاقت بھی نہیں ہوتی۔ مثلاً کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ فارم کے انڈوں میں وہ طاقت نہیں ہوتی جو دیسی انڈوں میں ہوتی ہے۔ یا کراسنگ سے پیدا ہونے والے آم اتنے مزے کے نہیں ہوتے اور اناج بھی اس طرح پیدا کیے جانے پر ان میں طاقت کم ہوجاتی ہے۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟

نہیں۔ یہ بات غلط ہے۔ کراس بیج اچھے اور عمدہ قسم کے ہوتے ہیں۔ فارم کے انڈوں میں اتنی ہی طاقت ہوتی ہے جتنی دیسی انڈوں میں۔ مزے میں فرق ضرور ہوسکتا ہے مگر طاقت میں دونوں انڈے برابر ہوتے ہیں۔ آم کے کراس بریڈ بھی عمدہ قسم کے ہوتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ کیا دو الگ الگ قسم کے جانوروں کا ہائی بریڈ بنانے سے اچھی نسل پیدا ہوسکتی ہے؟ مثلاً گھوڑے اور گدھی کے کراس سے کیا اچھی نسل پیدا ہوگی؟ جی نہیں۔ دو الگ الگ قسموں کے جانوروں کو کراس کرنے سے ہمیشہ اچھی نسل پیدا نہیں ہوتی۔ کیونکہ دونوں ایک گروپ سے تعلق نہیں رکھتے۔ گھوڑے اور گدھی کے کراس سے خچر پیدا ہوتا ہے جو نہ تو گھوڑا ہی ہوتا ہے اور نہ ہی گدھا۔ اس کا دوسرا ردِعمل یہ ہوتا ہے کہ خچر نامرد ہوتا ہے۔ اس کو صرف بوجھ اٹھانے یا گاڑی کھینچنے کے لیے انسان پیدا کرلیتا ہے۔

سومیٹک سیل (Somatic cells) کیا ہیں؟ اور ان سے پودا کیسے تیار ہوتا ہے؟ آلو اور ٹماٹر کے سیلس کو فیوز کر کے کچھ تجربات کیے گئے۔ ان کا کیا نتیجہ نکلا؟ دراصل ہمارا جسم سیلس سے بنا ہے۔ اس کی مثال آپ شہد کی مکھی کے چھتے سے لے سکتے ہیں۔ شہد کی مکھی کے چھتے کا ہر خانہ ایک سیل کی مانند ہے۔ اسی طرح ہمارا جسم بھی کروڑوں سیلس سے مل کر بنا ہے۔ ان سیلس کو سومیٹک سیلس کہتے ہیں۔

سومیٹک سیلس کو فیوز کر کے ہائی بریڈ بنایا جاسکتا ہے اور پھر ان سیلس کو Differentiate کر کے پودا بنایا جاسکتا ہے۔ عام طور پر آلو اور ٹماٹر کو ان کے پھولوں کے ذریعے کراس نہیں کرایا جاسکتا۔ لیکن سومیٹک سیلس کا استعمال کر کے یہ کراس ممکن ہوگیا ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ آم کی فصل ہر سال بہت اچھی نہیں ہوتی بلکہ اچھی

فصل ایک سال چھوڑ کے ہوتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس میں بھی جینٹکس کا عمل کارفرما ہے۔ ایک سال چھوڑ کے اچھی فصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اچھی فصل والے سال میں اتنے پھل آجاتے ہیں کہ پیڑ کی طاقت کم ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے آنے والے سال میں پھل بہت کم آتے ہیں۔ لیکن بعض قسموں میں جینٹکس کے اعتبار سے ایسی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں کہ Alternate Breaking نہ ہو اور ہر سال فصل عمدہ ہو۔

پوسا انسٹی ٹیوٹ نے حال ہی میں تجربے کے طور پر نیلم آم جو جنوبی ہندوستان میں بہت پیدا ہوتا ہے اور ہر سال اس کی فصل اچھی ہوتی ہے اور دسہری آم جو شمالی ہندوستان میں ایک سال چھوڑ کے اچھی فصل دیتا ہے، دونوں آموں کی قسموں کا ہائی بریڈ بنایا۔ اس سے پیدا شدہ آم کا نام ''ملکہ آم'' یہ آم اچھی قسم کا ہے۔ اس کراس سے فائدہ یہ ہوا کہ ملکہ آم ہر سال پوری فصل دیتا رہے گا۔ تجربہ گاہ سے یہ آم عوام تک پہنچ چکا ہے اور کافی مقبول بھی ہوا ہے۔

گیہوں، چاول، مکا، باجرہ، جوار، کپاس اور چارے کی کئی قسمیں پوسا انسٹی ٹیوٹ نے تیار کر لی ہیں جو جلد ہی پک کر تیار ہو جاتی ہیں اور زیادہ پیداوار دیتی ہیں۔ ان قسموں کی تیاری سے کھیتی باڑی کو بہت فروغ حاصل ہوا ہے۔

مستقبل میں انڈین ایگری کلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے بہت سے ریسرچ پلان ہیں جن میں کھیتی کے ہر پہلو پر سائنسی تحقیقات کی جائے گی تاکہ ہمیں معلوم ہوتا رہے کہ کھیتی کی مزید ترقی کیسے ہو؟ فصلوں کو بیماریوں سے بچانے کی دوائیں اور ترکیبیں ایجاد ہوتی رہیں گی۔ مٹی کی زرخیزی قائم رکھنے کے لیے کام ہوتا رہے گا۔ صاف پانی پر ریسرچ ہوتی رہے گی تاکہ وہ پانی جب پودوں کو دیا جائے تو پودے شاداب رہیں۔ جینٹکس کی مدد سے جانوروں کی نسلوں کو سدھارنے کا تحقیقی کام کرنال کا انسٹی ٹیوٹ کر رہا ہے۔ ابھی حال ہی میں ہندوستان نے ایک بہت اہم پروجیکٹ پر کام شروع کیا ہے جس میں چاول میں جینٹکس کے استعمال سے کاربوہائیڈریٹ کی مقدار بڑھا کر اس کی پیداوار میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ سائنس دانوں نے اس اہم تجربے کی برابری چاند کے مشن سے کی ہے۔ یہ ایک طویل مدتی پروجیکٹ ہے جس میں فلپائن کے بین الاقوامی ادارے انٹرنیشنل رائس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (IRRI) کا بھی تعاون حاصل ہے۔ چاول اپنے مزاج کے اعتبار سے "C-3 Photosynthesis" کے درجے میں آتا ہے جو اس کے کاربوہائیڈریٹ/ بائیوماس کا تعین کرتا ہے۔ اس پروجیکٹ کا مقصد یہ ہے کہ چاول کی Category بڑھا کر "C-4" کر دی جائے تاکہ اس میں کاربوہائیڈریٹ بھی زیادہ ہو جائے اور اس کی پیداوار بھی زیادہ ہو۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ کھیتی میں جینٹکس کی کتنی زیادہ اہمیت ہے۔ نہ صرف پیڑ پودوں کو ہی کراس کرنے سے عمدہ پیداوار اور عمدہ پھل اور اناج ملتے ہیں، بلکہ کھیتی کے جانوروں کی نسلوں کو سدھارنے میں بھی جینٹکس بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ دہلی کا انڈین ایگری کلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور خاص طور سے اس کا جینٹکس ڈپارٹمنٹ اپنے سائنسی تجربات سے عوام کو مستقل فائدہ پہنچا رہا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج کل کی کھیتی ''سائنسی کھیتی'' ہوگئی ہے جس میں جینٹکس ایک اہم رول ادا کر رہی ہے۔

□□□

پتہ:
46, Nishat Apartment, Near University Market,
Aligarh Muslim Univeristy
Aligarh-202002 (U.P.)

تعلیمی تشکیل نو کے مسائل

مصنف: خواجہ غلام السیدین

یہ کتاب ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ملک و بیرون ملک کے سیمیناروں میں پڑھے تھے۔ ان مقالوں میں انھوں نے تعلیمی عمل کو تدریسی اور تنظیمی دونوں نوعیتوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ موجودہ دور میں تعلیمی، مادی، سماجی اور اخلاقی ترقی سے متعلق جتنی نئی نئی تحقیقات سامنے آرہی ہیں اسی قدر ہم میں ناآسودگی اور بے چینی بھی بڑھتی جارہی ہے۔ ایسے میں ہمارا ہے، تجزیے اور عمل میں کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لیے یہ کتاب ہماری ذہنی تربیت کرتی ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/96 روپے

شمیم احمد صدیقی

خود پروردہ قاتل

اردو کے اکثر شعرا نے اپنے محبوب کو قاتل کا لقب دیا ہے اور اس کی دلفریب اداؤں پر قربان ہوجانے کو اپنے عشق کی معراج تصور کیا ہے۔

شعرا کا مجازی معشوق ایک چلتا پھرتا انسان ہوتا ہے ہم جس قاتل محبوب کا ذکر کرنے والے ہیں وہ جاندار نہیں بلکہ بے جان ہے۔ اس کی تخلیق گذشتہ صدی کے کچھ کیمیادانوں نے کی تھی اور اس کی گوناگوں صفات کو دیکھ کر لوگ اس پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ آج ہمارے ڈرائنگ روم، ڈریسنگ روم، باتھ روم، کچن غرض گھر کے گوشے گوشے پر اس کی حکمرانی ہے۔ ہماری مراد پلاسٹک سے تیار کیے گئے مختلف سازوسامان سے ہے۔ ڈرائنگ روم کی سجاوٹ کا آرائشی سازوسامان، ڈائننگ ٹیبل پر پڑا ہوا ٹیبل کور، اس پر استعمال ہونے والا ڈنر سیٹ، نمکدان وغیرہ، باتھ روم میں استعمال ہونے والا کنگھا، ٹوتھ برش، صابن دانی، لوٹا، مگ اور بالٹی، باورچی خانے میں رکھے ہوئے ڈبے اور جار، بچوں کے جھولنے والی کرسیاں، کھلونے، ٹفن باکس اور پنسل باکس، پورے مکان کی الکٹرک وائرنگ میں پلاسٹک چڑھا ہوا بجلی کا تار اور ان تاروں کو محفوظ رکھنے والا پائپ، بازار سے سامان لانے والے کیری بیگ، صحن میں کپڑے ٹانگنے کی ڈوری، حتیٰ کہ نماز اور پوجا پاٹھ میں استعمال ہونے والی چٹائیاں، غرض کہ روزمرہ استعمال میں آنے والی لاتعداد اشیا، جو کسی زمانے میں دھات، لکڑی، مٹی، کپڑے یا چمڑے سے تیار ہوا کرتی تھیں اب پلاسٹک سے بنتی ہیں۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ پلاسٹک سے تیار ان ہلکی، سستی، خاصی پائدار اور دیدہ زیب رنگوں میں دستیاب مذکورہ بالا کارآمد چیزوں کو آخر کس بنا پر قاتل کہا جارہا ہے اور انسان کی بنائی ہوئی یہ بے جان شے جاندار انسانوں کی قاتل کیوں قرار دی جارہی ہے؟ آپ صبروسکون سے چند منٹ میں مندرجۂ ذیل سطور پڑھ لیں تو شاید آپ کو اس سوال کا جواب مل جائے۔

ہم اپنی غذا کو نمکین اور ذائقہ دار بنانے کے لیے جو نمک استعمال کرتے ہیں وہ سوڈیم نام کی ایک دھات اور کلورین نام کی ایک گیس کا مرکب ہے جبکہ ہر جاندار کی زندگی کا ضامن پانی، ہائڈروجن اور آکسیجن نام کی گیسوں کا مرکب ہے۔ سوڈیم ایک ایسی دھات ہے کہ پانی میں ڈالتے ہی وہ پانی کو اپنے تعامل (reaction) سے ہائڈروجن اور آکسیجن میں بدل دیتی ہے اور اس عمل کے نتیجے میں اس قدر گرمی نکلتی ہے کہ ہائڈروجن گیس جلنے لگتی ہے جس کی وجہ سے سوڈیم کا ٹکڑا پانی میں ڈوبنے کے بجائے ایک جلتے ہوئے شعلے کی طرح پانی کی سطح پر چکرانے لگتا ہے۔ نمک کا دوسرا جز یعنی کلورین، ہرے پیلے رنگ کی ایسی خطرناک گیس ہے کہ اگر چند سیکنڈ بھی ہم کلورین کے ماحول میں سانس لیں تو سانس کی نلی اور پھیپھڑے اس بری طرح زخمی ہوجائیں گے کہ زندگی کے لالے پڑ جائیں گے۔ قدرت نے سوڈیم اور کلورین جیسے خطرناک اجزا کو نمک کی شکل میں نہ صرف مضبوطی سے باندھ کر رکھا ہے بلکہ اس کی ایک خاص مقدار کو ہمارے جسم کے لیے لازمی بھی بنا دیا ہے۔ دوسری طرف ہلکی سی چنگاری یا گرمی کی خاص مقدار پاکر جل اٹھنے والی ہائڈروجن گیس کو آکسیجن کے ساتھ مضبوطی سے باندھ کر تمام جانداروں کے لیے انتہائی ضروری شے یعنی پانی تیار کیا ہے۔ اس مثال سے یہ بات واضح ہوگئی کہ خالق کائنات نے مخلوق کو نقصان پہنچانے والے عناصر کو آزاد نہیں چھوڑا بلکہ انھیں مضبوط کیمیاوی بندھنوں میں باندھ کر اپنی مخلوق کے لیے انتہائی نافع بھی بنا دیا۔ آیئے آگے بڑھنے سے پہلے ہم اپنے رب کے اس فرمان کو دہرالیں ’’اور تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔‘‘

اصل موضوع کی جانب آنے سے قبل ایک بات اور عرض کردی جائے۔

آلو، چاول اور اس زمرے کی دوسری غذائی اشیا میں ایک بے مزہ یا برائے نام مزے والی شے کی بہتات ہے۔ اس کو عرف عام میں نشاستہ یا اسٹارچ کہتے ہیں۔ کیمیاوی لحاظ سے نشاستے کا سب سے چھوٹا ذرہ یا سالمہ کئی سو گلوکوز سالموں کے باہم تعامل سے وجود میں آتا ہے۔ جب ہم نشاستے والی کوئی غذا کھاتے ہیں تو معدے میں موجود مادے نشاستے کو گلوکوز سالموں میں بدل دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ذیابیطس (Diabetese) کے مریضوں کو نشاستے والی غذاؤں سے پرہیز کرایا جاتا ہے۔ کیمسٹری کی زبان میں نشاستے کو گلوکوز کا پالی مر (Polymer) کہتے ہیں۔ بہ الفاظ دگر کثیر تعداد میں ہم جنس سالموں کے تعامل (Reaction) سے وجود میں آئے کئی گنا بڑے مرکب (compound) کو پالی مر کہتے ہیں۔ قدرت نے کائنات میں مختلف قسم کے پالی مر پھیلا رکھے ہیں۔ سیلیولوز (Cellulose) بھی گلوکوز کا ایک پالی مر ہے لیکن اس میں گلوکوز کے سالمے قدرے مختلف انداز سے ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ درختوں کی پتیاں، لکڑی، گھاس، بھوسے اور کپاس وغیرہ کا بیشتر جز سیلیولوز ہی ہوتا ہے، اور چوپایوں کے جسم میں موجود ایک مخصوص مادے سیلیولیز (Cellulose) کے زیر اثر وہ گلوکوز کے سالموں میں ٹوٹ جاتا ہے۔ لہٰذا چوپائے درختوں کی ٹہنیوں، پتیوں وغیرہ کو کھا کر اپنی غذائی ضرورت پوری

کر سکتے ہیں۔ انسان نے اپنی عقل و فہم کو بروئے کار لا کر قدرت کے تخلیق کردہ پالی مروں کا تجزیہ کیا اور پھر مختلف کیمیاوی مادّوں کے باہم تعامل یا تال میل سے ازخود بہت سے پالی مر تخلیق کیے۔ چنانچہ اتھیلین (Ethylene) نام کی گیس سے پالی اتھیلین یا پالی تھین (Polythene) نام کا پالی مر، وِنائل کلورائڈ نام کی گیس سے (Polyrinyl chloride) یا پی وی سی (PVC) اور ٹٹرافلورو اتھیلین (Tetrafluoroethylene) نام کی گیس سے ٹیفلون (Teflon) نام کا پالی مر اور اس زمرے کے بیشمار پالی مر وجود میں آئے۔ یہ تمام پالی مر گرم حالت میں سیال کی شکل میں ہوتے ہیں جن کو مختلف سانچوں میں بھر کر ٹھنڈا کرنے پر من پسند شکل و صورت والی اشیا بنائی جاسکتی ہیں۔ ان پالی مروں میں چند خواص مشترک ہوتے ہیں۔ ان پر پانی کا کوئی اثر نہیں ہوتا، یہ اچھے مانع برق (Electric non-conductor) ہوتے ہیں اور ان کو کیڑے مکوڑے یا جراثیم وغیرہ اپنی غذا کے طور پر استعمال نہیں کر سکتے یعنی ان میں گلنے سڑنے کا عمل نہیں ہوتا۔ البتہ ان کی مضبوطی اور لچیلے پن میں نیز گرمی پا کر دوبارہ پگھلی ہوئی حالت پر آنے کی صفت میں ایک دوسرے سے کافی فرق ہوتا ہے۔ جو پالی مر قدرے لچیلے ہوتے ہیں ان کو پلاسٹک کے نام سے موسوم کیا جاتا اور ان میں سے بعض کو لفافے، تھیلے یا کیری بیگ بنانے میں، بعض کو بالٹی، مگ، اسٹول اور کرسیاں وغیرہ بنانے میں، بعض کو سرجیکل اوزار، موٹر کے کل پُرزے یا نان اسٹک (non-stick) برتنوں کی پرت کے طور پر اور بعض کو تانبے، لوہے یا المونیم کے تاروں پر مانع برق پرت چڑھانے یا موسم کے اثر سے بچانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح روزمرّہ استعمال کی شاید ہی کوئی چیز ہو جس میں کسی پلاسٹک کا استعمال نہ ہو رہا ہو۔ ان پلاسٹکوں کو مختلف رنگ دے کر دیدہ زیب بھی بنایا جاسکتا ہے۔ اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر تمام پلاسٹکوں میں پالی تھین کا استعمال کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔

اس قدر عمدہ صفات کی حامل اور کارآمد شے جس سے تیار کردہ سامان کو ہم دن رات استعمال کر رہے ہیں اس کو قاتل کیوں کہا جا رہا ہے یہاں کلیم عاجز کا ایک شعر یاد آتا ہے:

دامن پہ کوئی چھینٹ، نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

ہم بخوبی جانتے ہیں کہ کائنات کی ہر چیز فانی ہے۔ کسی چیز کی عمر چند ہفتہ ہے، کسی کی چند ماہ، کسی کی چند سال اور کسی کی کئی صدیاں، انسان کی عمر عموماً سو سال سے کم ہوتی ہے جبکہ پتھر اور سونے جیسی دھاتیں صدیوں تک برقرار رہتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے تصور کریں کہ اگر قدرت نے مچھر، مکھی جیسی پریشان کن مخلوق کی عمر سو سال رکھی ہوتی اور روزانہ لاکھوں نئے مچھر اور نئی مکھیاں پیدا ہوتی رہتیں یا قدرت نے انسانوں اور جانوروں کے فضلات اور ان کے مردہ جسموں کو گلنے سڑنے نہ دیا ہوتا تو بہت مختصر مدت میں یہ زمین نہ صرف لاتعداد مچھروں اور مکھیوں سے بھر چکی ہوتی بلکہ اس کا چپہ چپہ انسانوں اور جانوروں کے فضلات سے اور ان کے مردہ اجسام سے ایسا پٹ چکا ہوتا کہ ہم موت کو زندگی پر ترجیح دینے لگتے۔ اب ہم پالی تھین کے پاؤچ، تھیلوں یا کیری بیگ وغیرہ پر غور کریں جن کو اگر سو سال تک بھی زمین میں گاڑ کر چھوڑا جائے تو ان کے گل سڑ کر کھاد میں تبدیل ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ صرف ایک شہر میں روزانہ لاکھوں پالی تھین لفافے، تھیلے وغیرہ جن میں ہم بازار سے کھانے پینے کی اشیا، سبزیاں، کپڑے، جوتے وغیرہ لے کر گھر آتے ہیں، استعمال کے بعد کوڑے میں پھینک دیے جاتے ہیں۔ اکثر لوگ ان کو لاپروائی سے سڑکوں، پارکوں اور نالیوں میں بھی پھینک دیتے ہیں۔ اسی طرح پکنک منانے والی جگہیں اور سیاحتی مقامات کے اطراف و جوانب اور ان سے متصل تالاب، جھیل یا ندی بھی پالی تھین بیگ، پاؤچ یا خالی بوتلوں کی وجہ سے گندے رہتے ہیں۔ وزن میں ہلکا ہونے کی وجہ سے اکثر یہ چیزیں ہوا کے جھونکے کے ساتھ آبی ذخائر میں پہنچ جاتی ہیں اور پانی سے ہلکے ہونے نیز پانی میں نہ گلنے کی وجہ سے پانی کی سطح پر تیرتی رہتی ہیں جو ایک گندہ منظر پیش کرنے کے علاوہ مچھلیوں اور دوسرے آبی جانوروں کے تیرنے اور سانس لینے میں بھی رکاوٹ کا سبب بنتی ہیں۔ چنانچہ کانپور اور الٰہ آباد میں بہنے والی گنگا ندی، دہلی کی جمنا ندی، لکھنؤ کی گومتی ندی، حیدرآباد کی مشہور جھیل حسین ساگر، کشمیر کی ڈل جھیل اور اس طرح کے دیگر آبی ذخائر وقتاً فوقتاً لاکھوں روپے سالانہ خرچ پر صاف کرائے جاتے ہیں اور کچھ وقفہ گزرنے کے بعد پھر گندے ہو جاتے ہیں۔ نالیوں میں بہنے والے پالی تھین بیگ اور پاؤچ وغیرہ کسی جگہ اکٹھا ہو جاتے ہیں تو نالیوں میں پانی کے بہاؤ کو روک دیتے ہیں اور نتیجے میں گندہ پانی سڑک پر پھیل کر کیچڑ اور غلاظت پیدا کرتا ہے جس کی بنا پر سڑکوں پر آمد و رفت دشوار ہو جاتی ہے۔ کوڑے دانوں یا کوڑے کے ڈھیر پر پھینکے گئے پالی تھین بیگ وغیرہ سے ایک دوسرا نقصان بھی ہوتا ہے۔ عموماً شہروں کی صفائی پر مامور میونسپل عملہ شہر کے کوڑا گھروں سے کوڑے کرکٹ کو آبادی سے باہر لے جا کر کسی بڑے گڑھے کو پاٹنے اور آئندہ اس پر کوئی پارک وغیرہ بنانے کا کام کرتے ہیں۔ چونکہ کوڑے میں موجود لاتعداد پالی تھین بیگ مٹی میں برسوں پڑے رہنے پر بھی گلتے سڑتے نہیں ہیں اس لیے وہ مٹی کے مسامات کو بند کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں اور وہاں لگائے گئے پودوں کی نشوونما پر بڑا برا اثر ڈالتے ہیں۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ گرہستن عورتیں یا گھروں میں کام کرنے والی ملازمائیں گھروں میں بچی ہوئی کھانے کی اشیا اور سبزیوں اور پھلوں کے چھلکے پالی تھین بیگ میں بھر کر کوڑے

کے ڈھیر پر پھینک دیتی ہیں۔ سڑکوں پر پھرنے والے آوارہ مویشی اکثر کھانے کی چیزوں کے ساتھ پالی تھین بیگ بھی کھا لیتے ہیں جو ان کے معدوں میں بدستور پڑے رہتے ہیں اور مویشی کی جان تک لے لیتے ہیں۔ سستے قسم کی پالی تھین بیگوں یا تھیلوں میں وہ کیمیاوی مادّے جن سے تھیلے تیار کیے گئے ہیں یا وہ ان کو رنگین اور دیدہ زیب بنانے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں، تھوڑی بہت مقدار میں لگے رہ جاتے ہیں اور جب ان تھیلوں میں چکنائی سے تیار یا گرم غذائی اشیا مثلاً جلیبی، پوری وغیرہ رکھی جاتی ہیں تو وہ کیمیکل ان اشیا سے چپک کر ہمارے معدے میں پہنچ جاتے ہیں، ان کے زہریلے اثرات سے صحت پر براہ اثر مرتب ہونا لازمی ہے۔ پالی تھین اور اس زمرے کی دوسری پلاسٹکوں سے بنی اشیا کو ہم کاغذ یا لکڑی کی قسم کے کوڑے کرکٹ کی طرح جلا کر بھی ٹھکانے نہیں لگا سکتے کیوں کہ ان کے جلانے سے جو دھواں بنتا ہے وہ انتہائی زہریلا ہوتا ہے اور چاروں طرف کی فضا کو بے حد آلودہ کر دیتا ہے۔

پالی تھین اور دیگر پلاسٹک اشیا کے نقصانات کا ادراک ہونے کے بعد تمام دنیا کے جرثومی سائنس (Mierobiology) کے ماہرین ایسے جرثومے تلاش کرنے میں منہمک ہیں جو پلاسٹک اشیا کو بطور غذا استعمال کر کے اسی طرح ٹھکانے لگا سکیں جس طرح بیکٹیریا وغیرہ درختوں کی شاخوں اور پتیوں کو، ہمارے فضلات کو یا مردہ جانوروں کے جسموں کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں تاکہ تمام عالم اس خاموش قاتل سے نجات پا جائے۔ لیکن جب تک اس سمت میں کامیابی ملے اس وقت تک ہم پلاسٹک اشیا کے نقصانات سے بچاؤ کے لیے کیا کریں؟ کئی صوبوں کی حکومتوں نے اور مقامی میونسپل کارپوریشنوں نے پالی تھین کے استعمال پر قانونی پابندی بھی عائد کرنے کی کوشش کی لیکن ظاہر ہے کہ جب انسان کسی تن آسانی کا عادی ہو جاتا ہے پھر اس سے نکلنا اس کے لیے سہل نہیں ہوتا لہٰذا فی الوقت ہم دو ہی کام کر سکتے ہیں۔ اوّل تو عوام الناس کو پالی تھین وغیرہ کے ممکنہ نقصانات سے بخوبی واقف کرایا جائے تاکہ وہ اس کا استعمال کم سے کم کریں۔ دوسرے یہ کہ استعمال شدہ پالی تھین اور پلاسٹک وغیرہ کو اکٹھا کر کے ان کو ری سائیکل (Recycle) کیا جائے یعنی ان کو صاف کر کے اور پگھلا کر دوبارہ اپنی ضرورت کا سامان بنا لیا جائے، ہمارے ملک سمیت دنیا کے بہت سے ممالک میں یہ عمل کافی برسوں سے چل رہا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ری سائیکل کے عمل سے تیار شدہ اشیا زیادہ پائدار اور دیدہ زیب نہیں ہوتیں۔ ہم اپنے شہروں میں ہر صبح کو سڑکوں اور کوڑے کے ڈھیروں سے پلاسٹک کے تھیلوں وغیرہ کے چننے والے بہت سے غریب بچوں اور عورتوں کو دیکھتے ہیں جو اس طرح اکٹھا کی گئی اشیا کو کسی کباڑی کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں اور ہم کو بڑی آفت سے نجات دلاتے ہیں۔ ہم سب کو ان کا احسان مند ہونا چاہیے۔

□□□

پتہ:
C-2, Naseem Manzil, Madeh Ganj,
Police Chawki, Sitapur Road, Lucknow-20

اتحاد سے انتشار کی طرف

مصنف: پروفیسر مشیر الحسن

اودھ کی گم ہوتی ہوئی قصباتی تہذیب اس ہند ایرانی ثقافتی ورثے کی امین رہی ہے جو ہمارے صدیوں کے ثقافتی میل جول کی دین تھا۔

پروفیسر مشیر الحسن کی یہ کتاب جو ایک مورخ کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے مختلف مذہبی فرقوں کے ان باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے جو کثرت میں وحدت کی آئینہ داری کرتے تھے۔ قصبات کی روزمرّہ کی زندگی رسم و رواج، سماجی اور مذہبی تقریبات، ان سب چیزوں کا ایسا دانشورانہ بیان جو دلچسپ بھی ہے اور خیال انگیز بھی۔

صفحات: 415

قیمت: -/216 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

محمد اعجاز

ٹیکنیکل رائٹنگ کی ضرورت وافادیت

ہندوستان میں ٹیکنیکل رائٹنگ کی روایت بالکل نئی اور کافی کمزور ہے۔ سائنس اور تکنیکی شعبے سے وابستہ معلومات اور حقائق کو پیش کرنے کے طریقے کو ٹیکنیکل رائٹنگ کہتے ہیں۔ صنعتی، سماجی اور اقتصادی شعبوں میں آگے بڑھنے کے لیے تکنیکی ترقی ضروری ہے، کیونکہ جیسے جیسے سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبے میں ہندوستان ترقی کر رہا ہے، اطلاعات کے تبادلے کی ضرورتیں بڑھتی جارہی ہیں۔ تکنیکی ترقی کے لیے بڑے پیمانے پر منصوبے تیار کیے جاتے ہیں اور ان کو روبہ عمل لایا جاتا ہے۔ پھر چاہے خلا یا نیوکلیئر ٹیکنالوجی کی بات ہو یا کاشت کاری کے فروغ کی، دواسازی کا میدان ہو یا مواصلات، کمپیوٹر اور مصنوعات کی تیاری، تمام شعبوں میں تکنیکی علم کے تبادلے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے لیے ٹیکنیکل رائٹرس کی ضرورت پڑتی ہے۔ دراصل اس شعبے کی اہمیت تب سے زیادہ بڑھنے لگی جب مصنوعات تیار کرنے والوں نے وہ طریقے ڈھونڈنا شروع کیے جن سے انھیں اپنی مصنوعات کو بیچنے میں آسانی ہو جس طرح کسی بھی نمائندے کو اپنی بات کہنے میں بصری امداد (Visual aid) سے بہت سہارا ملتا ہے، اسی طرح بروشر وغیرہ کی بدولت موبائل فون اور کئی طرح کی تکنیکی مصنوعات کی فروخت میں آسانی ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تکنیکی مصنوعات کی خوبیوں کو پرکشش طور پر بیان کرنے کی صلاحیت رکھنے والے ٹیکنیکل رائٹرس کی مانگ روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔

پچھلے کچھ برسوں میں ہندوستان میں ٹیکنیکل رائٹنگ کے شعبے میں خاصی پیش رفت ہوئی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ امریکی ملٹی نیشنل کمپنیوں نے سافٹ ویئر ڈولپمنٹ سے متعلق اپنے پروجیکٹس کے لیے ہندوستان کی طرف رخ کیا ہے اور وہ اپنی مصنوعات کی تشہیر ہندوستانی عوام کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کرنا چاہتے ہیں۔ مصنوعات کے سلسلے میں معلومات، ان کے استعمال اور رکھ رکھاؤ سے متعلق ہدایات، پیداواری منصوبوں کے خاکے، مصنوعات کی فہرست، بروشر کی تیاری وغیرہ کا کام ٹیکنیکل رائٹر کرتے ہیں وہ آن لائن معلومات کی فراہمی کا کام بھی کرتے ہیں۔ کمپنیوں کے ملازموں کے علاوہ کچھ سائنسداں، انجینئر اور تکنیک کار ٹیکنیکل رائٹنگ کے شعبے میں فری لانسنگ بھی کرتے ہیں۔ ٹیکنیکل رائٹرس کو معاوضہ بھی اچھا ملتا ہے۔ کسی کسی ٹیکنیکل رائٹر کی کمائی 20 لاکھ روپے سالانہ تک بھی ہوتی ہے اس شعبے میں ایک نووارد کی آمدنی بھی اچھی ہوجاتی ہے۔

ٹیکنیکل رائٹنگ کے شعبے میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے آپ کو اولاً ملٹی ٹاسکنگ پر دھیان دینا ہوگا۔ ٹیکنیکل رائٹر کو تکنیکی مواد، متعلقہ گرافکس کی تیاری، استعمال کرنے والوں کی سہولت اور مارکیٹنگ کے طریقوں وغیرہ کو دھیان میں رکھتے ہوئے کام کرنا ہوتا ہے۔ جس طرح سے سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبے میں ہندوستان ترقی کر رہا ہے، اسے دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آنے والے وقت میں ٹیکنیکل رائٹرس کی زبردست مانگ ہوگی۔ کاشت کاری، حفظان صحت، دواسازی، مواصلات، مصنوعات وغیرہ شعبوں میں نکلنے والے اخبارات و رسائل میں ٹیکنیکل رائٹر یا ایڈیٹر کی ضرورت ہوتی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی سے متعلق وزارتوں میں خاص طور پر ٹیکنیکل رائٹرس کی مانگ ہوتی ہے۔ ان سب کے علاوہ ایک فری لانسر کی شکل میں متعلقہ کاموں کو آن لائن بھی انجام دیا جاسکتا ہے۔

موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ بین الاقوامی سطح پر بننے والے اشتہارات کے مقابلے میں ہندوستان میں بننے والے اشتہارات کا معیار کافی کمزور ہوتا ہے۔ بیرونی ممالک میں مصنوعات کے تکنیکی پہلو کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا جاتا ہے جبکہ کئی ہندوستانی اشتہارات میں مصنوعات کی خوبیوں پر زور دیا جاتا ہے۔ خیال بہت اہم چیز ہے لیکن اس سے بھی زیادہ اہم ہے اسے پیش کرنے کا طریقہ۔ اور جب بات تکنیکی شعبے کی ہو تو ذمے داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ تکنیکی تحریر کو واضح مختصر اور آسان ہونا چاہیے جسے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ یہ زمانہ اختصاص کا ہے اس لیے ٹیکنیکل رائٹرس بھی الگ الگ شعبوں سافٹ ویئر، ڈاکو مینٹیشن، ٹیوٹوریلس یا یوزر مینولس وغیرہ میں اختصاص پیدا کر لیتے ہیں۔ تیز فہم ہونے کے ساتھ ہی اگر انگریزی زبان پر آپ کی اچھی پکڑ ہے تو ٹیکنیکل رائٹنگ آپ کے لیے ایک اچھا وسیلۂ روزگار ثابت ہوسکتی ہے۔

اس سلسلے میں مفید ویب سائٹس:

www.techtree.com, www.twin-india.org
www.icivilengineer.com, www.dept.kent.edu
www.writing-portal.com, www.techwr-l.com
www.chillibreeze.com,
www.knowgenesis.org
www.erazgar.wordpress.com

□□□

پتہ:
S/o Abdul Waris,
Raja Tola, Harlakhi,
Madhubani, Bihar-847225

وقار صدیقی

ظفر احمد نظامی

ظفر احمد نظامی کے اجداد شرکوٹ ضلع بجنور کے باشندے تھے ان کے والد حکیم جمیل احمد نے طبیہ کالج دلی سے حکمت کا امتحان پاس کر کے راجستھان کی ایک ریاست پرتاب گڑھ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ظفر 21 اکتوبر 1936 کو وہیں پیدا ہوئے۔ بعد ازاں ان کے والد رتلام (مدھیہ پردیش) میں آبسے تھے، جہاں ظفر نے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ اندور گئے اور ہولکر کالج سے پہلے انگریزی ادب اور پھر سیاسیات میں ایم اے اول درجے میں اعزازی حیثیت سے پاس کیا اور وہیں محکمۂ تعلیمات سے منسلک ہوکر انگریزی کے لیکچرار بن گئے۔ 1963 میں وہ گورنمنٹ ڈگری کالج دتیا کے شعبۂ سیاسیات میں پہنچ گئے اور وہاں سے ان کا تبادلہ گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج شوپوری ہوگیا۔

انھوں نے جیواجی یونیورسٹی گوالیار سے ''ہندوستانی سیاست میں قوم پرور مسلمانوں کا حصہ'' کے عنوان پر مقالہ قلمبند کر کے پی. ایچ. ڈی. کی ڈگری حاصل کی ان کے ممتحنوں میں ڈاکٹر بردے ناتھ کنزرو اور پروفیسر رشید الدین خاں ممبر تھے۔

ظفر اردو کی تحریکوں اور تنظیموں سے بھی ہمیشہ وابستہ رہے۔ اردو کے حق میں یوپی کی اکیس لاکھ دستخطوں والی مہم میں بھی انھوں نے بیگم سلطانہ حیات کے ساتھ نمایاں طور سے کام کیا تھا۔ اندور کے علاوہ دیتا اور شوپوری میں اپنے قیام کے دوران انھوں نے انجمن ترقی اردو کی شاخیں قائم کیں۔ 1958 میں جب بھوپال میں ایم عرفان مرحوم نے انجمن ترقی اردو کی صوبائی کانفرنس کا انعقاد کیا تو ظفر نظامی، عزیز اندوری اور حبیب عالم نے اندور شاخ کی نمائندگی کی۔ ظفر نے ریاستی انجمن ترقی اردو مدھیہ پردیش کے جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے چھے سال تک کام کیا۔ 1961 میں نعیم کوثر کے ساتھ مل کر بچوں کے خوبصورت اور معیاری رسالے ''جگنو'' کا اجرا کیا جو کچھ مدت تک پابندی کے ساتھ شائع ہوتا رہا مگر پھر دیگر مصروفیات کے باعث بند کر دینا پڑا۔ جب تک وہ مدھیہ پردیش میں رہے، وہاں کے بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کی بورڈ آف اسٹڈیز کے ممبر رہے۔

دہلی پہنچ کر ان کی تعلیمی اور علمی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہوگیا۔ وہاں انھوں نے وزارت تعلیم میں انڈین کونسل ہسٹاریکل ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے کام کیا اور اس کے پروجیکٹ "The Role of Sind Legislature in the freedom struggle" کے ڈائرکٹر رہے۔ اس کے بعد انھوں نے ڈاکٹر رادھا کرشنن کے بیٹے اور ممتاز تاریخ داں پروفیسر ایس گوپال کی نگرانی میں Towards Freedom نامی پروجیکٹ میں کام کیا۔ بعد میں وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ سیاست میں لیکچرار ہوگئے اور بتدریج ریڈر اور پروفیسر کے منصب پر فائز ہوئے۔ صدر شعبۂ سیاسیات کے ساتھ ساتھ ہی وہ گیارہ سال تک اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر رہے اور یونیورسٹی ایڈمنسٹریٹرس کالج کے ڈائرکٹر بھی رہے۔ اس حیثیت سے انھوں نے ملک بھر کے کالجوں کے اساتذہ اور یونیورسٹیوں کے اعلیٰ افسران کو تربیت دی۔ وہ جامعہ ملیہ میں سوشل سائنسز فیکلٹی کے ڈین بھی رہے۔

ظفر ایک ہر دلعزیز استاد تھے۔ وہ طلبہ اور اساتذہ میں یکساں مقبول رہے۔ ان کی نگرانی میں 35 طلبہ نے پی. ایچ. ڈی. کی ڈگری حاصل کی۔ وہ ملک کی 35 یونیورسٹیوں کے پی. ایچ. ڈی. کے ممتحن رہے اور پندرہ یونیورسٹیوں کی بورڈ آف اسٹڈیز کے ممبر۔ وہ یونین پبلک سروس کمیشن کے علاوہ مدھیہ پردیش، آندھرا پردیش، بہار، ہریانہ، راجستھان، جموں و کشمیر، ہماچل پردیش پبلک سروس کمیشنوں سے بھی وابستہ رہے۔ دلی کے اسٹاف سلیکشن بورڈ سے بھی متعلق رہے۔ وہ ڈاکٹر ذاکر حسین ایجوکیشنل اینڈ کلچرل فاؤنڈیشن کے بانی رکن تھے اور انڈیا اسلامک سینٹر کے حیاتی رکن رہے۔ دلی اردو اکادمی کی گورننگ کونسل اور اس کی ایگزیکیٹو کونسل کے ممبر اور تعلیمی کمیٹی کے چیئرمین بھی رہے۔ وہ انڈو عرب فریٹرنٹی، فرینڈس آف لیبیا سوسائٹی اور انڈو سوڈان فرینڈ شپ سوسائٹی کے نائب صدر رہے۔ وہ این سی ای آر ٹی کی پولیٹکل سائنس کمیٹی کے ممبر تھے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی کمیٹیوں سے بھی وابستہ رہے۔ وہ حکومت ہند کی CSTT کی ایکسپرٹ کمیٹی کے رکن بھی تھے۔

ظفر کو شعر و ادب سے شغف شروع سے ہی رہا۔ انھوں نے تیرہ سال کی عمر میں پہلا شعر کہا اور قطعات کہنے میں کمال حاصل کیا۔ ان کی شاعری اور افسانوں کا مزاج رومانوی ہے۔ انھوں نے اپنے قطعات میں جذبات کی صداقت کو شاعرانہ پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں الفاظ اور موضوع کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ان کا ایک قطعہ دیکھیے:

زیست معتوب ہوگئی اے دوست
دل لگی خوب ہوگئی اے دوست

جو بھی دیوانگی کی بات ہوئی
مجھ سے منسوب ہوگئی اے دوست

اس طرح وہ زندگی کے درد وکرب کا رشتہ بھی رومانی کیف اور سرمستی سے جوڑ دیتے ہیں۔

ظفر نظامی کی غزلوں میں لفظوں کے رنگ و آہنگ سے نئے مرکب پیدا کرنے کا انداز ملتا ہے لیکن ماضی کی یادوں سے گہرا لگاؤ بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ وہ یادوں کا شہر بسائے گلی گلی سرگرداں ہیں۔ حالانکہ سوئی ہوئی تقدیر کو جگانے کے لیے ان کے ذہن میں ایک دھندلا سا ہی سہی، نقشہ بھی موجود ہے:

میں یادوں کا قیدی بن کر یادوں کی زنجیر لیے
جانے کب سے جاگ رہا ہوں سوئی ہوئی تقدیر لیے
یادوں کا اک شہر بسائے گھوم رہا ہوں گلی گلی
ذہن میں اک دھندلا سا نقشہ، دل میں اک تصویر لیے

ایک اور غزل میں یہ جذبہ یوں ابھرتا ہے:

جھوم رہی ہے دل میں یاروفصلِ بہاراں برسوں سے
گھوم رہا ہے آنکھوں میں اک شہرِ نگاراں برسوں سے
برسوں ہم نے ناز اٹھائے، برسوں ہم نے ظلم سہے
اورہمیں سے برگشتہ ہے بزمِ نگاراں برسوں سے

وہ اپنی غزل میں عصرِ حاضر کی بے رحم اور کھردری حقیقتوں کو تجربے کی قوت اور احساس کی شدت کی بنا پر اس طرح پیش کرتے ہیں:

سنگ و آہن بن کر کھیلیں دل سی نازک شے سے لوگ
میری بستی میں بستے ہیں جانے کیسے کیسے لوگ
موجِ حوادث ٹھہرا اٹھی دیکھ کے ہم دیوانوں کو
موجِ حوادث کبھی ہوگی ہم ہیں ایسے ویسے لوگ

ظفر کی نظمیں بھی رومانی فضا سے معمور ہیں اور غزل کا غنائی آہنگ نظموں میں بھی موجود ہے۔ غرضیکہ ان کی شاعری دل کی شاعری ہے محض دماغی ورزش نہیں۔

انھوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کی طرف بھی توجہ کی ان کے افسانے جو معیاری پرچوں میں شائع ہوتے رہے، اس کے علاوہ انھوں نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا اور کئی کتابیں تصنیف کیں، ان میں سے چند کتابیں یہ ہیں۔

(1) معمارانِ جامعہ (2) ہندوستان کے چند سیاسی رہنما (3) حکیم اجمل خاں (4) مولانا آزاد (5) تاریخ ہند: عہد جدید (6) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (7) جنید بغدادی

ظفر نے انگریزی میں بھی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان میں یہ بہت مقبول ہوئیں:

(1) Makers of Modem India

(2) The Peoples Prime Minister

(3) Hakim Ajmal Khan

(4) Dr. Zakir Husain: A Pictorial Biography

انھوں نے انگریزی سے کئی کتابوں کو اردو میں منتقل کیا۔ ان میں پروفیسر علی اشرف سابق وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تصنیف The Muslim Elites بھی ہے جسے ظفر نے ''مسلم اکابرین'' کے نام سے اردو میں ڈھالا اور ساہتیہ اکادمی دہلی نے اردو ادب کے معمار سلسلے کے تحت، نامور افسانہ نگار کوثر چاند پوری کے فکر وفن پر ان کا تحریر کردہ تحقیقی تجزیہ شائع کیا۔

ظفر کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے شخصیات کو متعارف کرانے کے لیے ''قلمی چہرہ'' کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا جو دس سال تک ''بیسویں صدی'' میں جاری رہا۔ خاکہ نگاری میں ان کا اسلوب بالکل جدا ہے اور مقفیٰ و مسجع عبارت میں رجب علی سرور اور رتن ناتھ سرشار کی یاد دلاتا ہے۔

ان کا قلم مسلسل رواں دواں رہا اور وہ انگریزی اور اردو میں مضامین لکھتے رہے جو اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔ وہ ایک متحرک اور فعال شخصیت کے مالک تھے جو سماجی خدمات کے میدان میں بھی سرگرم عمل رہے۔ وہ ایک نیک اور شریف النفس انسان تھے اور دوسروں کے کام آنا ان کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ میرے ان سے مراسم پچاس سال پرانے تھے اور وہ میرے عزیز دوست بھی تھے۔ ان پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن ابھی اتنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

ایسی فعال اور متحرک شخصیت کا مختلف امراض کا شکار ہوکر صاحبِ فراش ہوجانا اور 23 اپریل 2009 کو اس دنیا سے رخصت ہوجانا، علمی و ادبی دنیا کا ایک بڑا خسارہ ہے۔ ان کی علمی، تعلیمی اور ادبی خدمت کا اعتراف ہمیشہ کیا جائے گا۔

□□□

پتہ:
103, Gardem Homes,
Phase-III, Alkapuri,
Gwalior-474006 (M.P.)

عبدالرحیم نشتر

ابوالمجاہد زاہد

ابوالمجاہد زاہد— نام ہے اس شخص کا جس نے ساری عمر حق وصداقت کی تبلیغ کی اور اس راہ میں پیش آنے والی ہر افتاد کو صبر وسکون سے برداشت کیا۔ اکہرے بدن کے اس دبلے پتلے شخص کو قدرت نے جو تخلیقی وصف عطا کیا تھا، اس نے اس کے حقوق نہایت ایمان داری اور متانت کے ساتھ ادا کیے۔ ضلع لکھیم پور کھیری کے ایک گاؤں سنہرا رامپور میں محمد زاہد علی نے 28 جون 1928 کو آنکھیں کھولیں تو اسے اطراف میں پھیلی ہوئی زندگی کا عرفان نہ تھا لیکن جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی شعور کی بالیدگی نے خیر وشر کی پرتیں کھولیں اور اسے زندگی اور مقصدِ زندگی سے آگاہ کیا۔ شریف الطبع اور دیندار والدین کی گود میں پروان چڑھنے والے نوخیز محمد زاہد علی نے زندگی کے بہت سے نشیب وفراز دیکھے لیکن اسلامی فکر ونظریات جو اس کی وراثت تھے، مشکل حالات میں ہمیشہ مددگار ثابت ہوئے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہ آئی۔

1942 میں جب گاندھی جی نے انگریزو! ہندوستا چھوڑو، کا نعرہ بلند کیا تھا وہ برصغیر میں جوش وخروش کا ایک عجیب دور تھا۔ پورے ملک میں روحِ آزادی پھڑپھڑا رہی تھی اور فرنگی جبر واستبداد کی چولیں ہلنے لگی تھیں۔ مختلف عوامی طبقے جدوجہدِ آزادی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، اردو شاعری بھی اس جنگِ آزادی میں پوری طرح شریک تھی۔ حریت کے نغمے گونج رہے تھے اور شعرائے اردو جذبۂ آزادی کو فروغ دے رہے تھے۔

اتر پردیش کی شاعرانہ فضا نے 14 سالہ محمد زاہد علی کو شاعر بنا دیا۔ 1943 میں اس نے اپنے عہد کے مقبول ومحترم سخنور علامہ سیماب اکبرآبادی کی شاگردی اختیار کی اور استادِ محترم نے ابوالمجاہد زاہد کو 1945 میں فارغ الاصلاح قرار دے دیا۔ یہ وہ دور تھا کہ برصغیر میں اردو شاعری کے آفتاب وماہتاب جگمگا رہے تھے، اس وقت ترقی پسند ادب اور رومانوی تحریک سے وابستہ فنکاروں کا طوطی بول رہا تھا۔ اردو نظم نئی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ دوسری طرف علامہ اقبال کی شاعری اپنی فکری اساس اور مومنانہ لے کے ساتھ فضا پر چھائی ہوئی تھی ابوالمجاہد زاہد نے بھی اپنے لیے یہی راستہ منتخب کیا۔ ان کی شاعری اسلامی فکر ونظریات کے پیرہن میں ملبوس تھی مگر اس کی جاذبیت، اثر آفرینی اور کشش نے ایک بڑے حلقے کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

ڈاکٹر ابن فرید کے مطابق: ”زاہد نے کلاسیکی اصطلاحات، استعارات، تلمیحات وعلامات کو ایک ورثے کے طور پر استعمال کیا ہے، جس نے ان کے کلام میں ماضی سے وابستگی اور تسلسل کو برقرار رکھا ہے۔ وہ اس رشتے کو ختم کرنا نہیں چاہتے ہیں، جو ان کی تہذیب وثقافت نے انھیں ورثے کے طور پر عطا کیا ہے۔ انھیں اس امر کا واضح شعور ہے کہ ان کا معاشرہ وثقافت ان کا سیاق ہیں جن کے حوالے سے ان کی شناخت بنتی ہے۔“

ابوالمجاہد زاہد ماضی سے وابستگی اور تسلسل کو برقرار رکھنے نیز اپنی مخصوص تہذیب وثقافت سے وابستہ رہنے کے باوجود ادب کا عام ذوق رکھنے والوں کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کی شاعری محض اسلامی مکتبِ فکر کی عکاس نہیں۔ وہ انسانیت کے شاعر ہیں۔ روایت پسندی کے باوجود ان کے یہاں ایسے متعدد اشعار مل جاتے ہیں جن پر نئی فکر اور نئی شاعری کا گمان ہونے لگتا ہے۔

تگ وتاز (اولین مجموعۂ کلام مطبوعہ 1957) کھلتی کلیاں (بچوں کی نظموں کا مجموعہ مطبوعہ 1957-1960) اور ید بیضا (دوسرا مجموعۂ کلام مطبوعہ 1998) یہ تینوں مجموعے اسلامی فکر ونظر کی حد بندی کے باوجود شاعر کے پرخلوص اظہار کا کھلا آسمان ہیں۔ 6 مارچ 2009 کو ان کی رحلت سے اردو شاعری ایک مخلص ومنفرد فنکار سے محروم ہوگئی ہے۔

کھلی جو آنکھ تو افسونِ خواب ٹوٹ گیا
ابھی ابھی کوئی چہرہ مری نظر میں تھا

کوئی تو روشنی کا شناسا ملے کہیں
پھرتا ہوں کالے شہر میں جلتا دیا لیے

دھوپ کے ماروں کو جس کی چھاؤں میں راحت ملے
ریگ زارِ زندگی میں وہ شجر ہوجایئے

یہ سوچو کیسی راہوں سے گزر کر میں یہاں پہنچا
یہ مت دیکھو مرے دامن میں الجھے خار کتنے ہیں

جس پہ برسا نہ ہو کوئی بادل
ایسا صحرا ہوں، ایسی پیاس ہوں میں

کوئی درخت نہیں زندگی کے صحرا میں
کہیں جو سایہ نظر آئے تو قیام کروں

دل میں یوں یاد تری آتی ہے
جیسے گلشن میں نسیم سحری

جانے کب ٹوٹ جاؤں ٹہنی سے
زرد پتہ ہوں، تھرتھراتا ہوں

کلی کلی کو دیا ہے شگفتگی کا پیام
چمن میں جب بھی چلے ہم، چلے صبا کی طرح

کیا خبر تھی کہ نہ اٹھیں گے اگر بیٹھیں گے
ہم یونہی بیٹھ گئے تھے تری دیوار کے پاس

آندھیاں بن بن کے اٹھتے ہیں بجھانے کے لیے
کھل رہا ہے شب پرستوں کو مرا جلتا دیا

بھینٹ چڑھا دی ساری ہمت ساحل کی آسائش پر
طوفانوں سے لڑنے والے ڈوب گئے میدانوں میں

ماں کے اٹھتے ہی بھرے گھر میں اندھیرا چھا گیا
ایک سورج سے منور کتنے ہی مہتاب تھے

آندھی بنی تو جوش جنوں اور بڑھ گیا
خوداپنے سر پہ خاک اڑانے لگی ہوا

وہاں پہ جشن بہاراں عجیب لگتا ہے
جہاں جلائی گئیں بستیاں گلابوں کی

شہر کی لعنتوں نے آگھیرا
گاؤں بھی اب تباہ ہونے لگے

لگ گئی آگ ساری بستی میں
''روزناموں'' کا یہ ہنر نکلا

لاکھ دیوار چمن راستہ روکے لیکن
بوئے گل کی بھی کہیں خوئے سفر جاتی ہے

غصے میں بھی لبوں سے تبسم جدا نہ ہو
وہ اس طرح خفا ہے کہ جیسے خفا نہ ہو

تیری تصویر میں کیا رنگ بھروں
مجھ سے اپنی ہی نہ تصویر بنی

روانی ہے کہ گھٹتی جارہی ہے
ندی شاخوں میں بٹتی جارہی ہے

مسکرانا ہمیں نصیب کہاں
یوں تو سو بار مسکراتے ہیں

پھر بھی ہے بہت فاصلہ دونوں کے دلوں میں
دیوار سے دیوار پڑوسی کی ملی ہے

مندرجہ بالا اشعار ''ید بیضا'' سے لیے گئے ہیں۔ ابوالمجاہد زاہد کا یہ دوسرا مجموعۂ کلام ہے جو 1998 میں شائع ہوا تھا۔ اس کہنہ مشق و بزرگ شاعر کے کلام میں جو تازگی فکر اور عصری حسیت نمایاں ہے وہ انھیں ایک ممتاز و معتبر شاعر ثابت کرتی ہے۔ ان کی لفظیات، اشارات اور استعارے انھیں جدید شاعری کے لب و لہجے سے قریب تر کرتے ہیں اور یہی وہ پیرایۂ اظہار ہے جو اسلامی مکتبِ فکر یا مذہبی حصار بندی کے باوجود انھیں ایک کھرا اور کھنکتا ہوا شاعر ٹھہراتا ہے۔

ابوالمجاہد زاہد نے مسلم معاشرے کے پس و پیش منظر کو اپنی شاعری کا محور بنایا ہے لیکن ان کی شاعری کسی زاویے سے بھی یک رخی نہیں معلوم ہوتی۔ اللہ رسولؐ قرآن اور دین حنیف کے بہت سے پہلو ان کی نظموں اور غزلوں میں جھلکتے ہیں، لیکن ان کی شعریت اور شعری اظہار ان کے شاعرانہ جمال کو مدھم نہیں پڑنے دیتا۔ انھوں نے اقبال اور سیماب سے اثر تو لیا ہے لیکن اپنی انفرادیت بھی بنائے رکھی ہے۔ یہی انفرادیت ابوالمجاہد زاہد کو ایک معتبر اور موقر شاعر بناتی ہے۔ انھوں نے گھسے پٹے مضامین اور فرسودہ اسلوب سے گریز کرتے ہوئے فکری تازگی اور عصری معنویت کی ایک فضا قائم کی ہے۔ اس لحاظ سے وہ اپنی پیرانہ سالی اور بزرگی کے باوجود ایک جواں سال اور تازہ فکر شاعر تھے۔ □□□

پتہ:
Saudabi Apartment,
Flat No. A-9, Goregaon,Raigad-402103

بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ہیں۔
گھروں میں بہتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔
اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ہم سب کا فرضِ اولیں ہے۔

چودھری محمد علی ردولوی

(ہماری مطبوعات سے)

راقم الحروف محمد علی رُدولوی عفی عنہ

راقم الحروف محمد علی ردولوی عفی عنہ انانیت کا شکار باوجود استغفار کے بھی انانیت کا شکار ہی رہتا ہے۔ ''میں'' کے استعمال سے پریشان ہے مگر ''میں'' پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ناچار آپ بھی درگذر سے کام لیجیے اور اگر کوئی اچھی بات نکل آئے تو اس کو قبول کیجیے۔ نہیں تو بہ نظر عبرت میرے لیے دعائے خیر کیجیے اور اس تحریر اور تحریر کرنے والے کو بھول جائیے۔

لارڈ مارلے کو جب وائیکاؤنٹ کا خطاب بادشاہ انگلستان نے دیا تو انھوں نے لارڈ منٹو کو لکھا ''ملک اور قوم کی خدمت میں عمر کاٹ دی، اس بڑھاپے میں وہ چیز گلے پڑی جس سے عمر بھر بگاڑ رہا۔ اب آخر عمر میں خطاب کلنک کا ٹیکہ ہو کے ماتھے پر لگا۔ تو حبِ وطن کے لیے یہ بھی قبول ہے۔ اس بڑھاپے میں دربار عوام کی محنت نہ ہو سکے گی، لیکن اس ذریعے سے دربار امراہی میں کچھ تھوڑا بہت مشغلۂ خدمت جاری رہے گا، نہ معلوم سچ یا جھوٹ اسی طرح میں بھی اپنے دل کو سمجھاتا ہوں کہ یہ حقیر ''میں'' کی بھرمار اسی وجہ سے کر رہا ہے۔ خدا جانے اصلیت کیا ہے۔

میں شیعہ گھر میں پیدا ہوا اور شیعہ تربیت پائی لیکن تبرا سے ہمیشہ نفرت رہی۔ یہ پہلی بنا مذہب سے بغاوت کی تھی جو مجھ کو یاد ہے۔ میری بڑی بہن مرحومہ کے لیے ایک مولوی نوکر تھے۔ جب میری بسم اللہ ہوئی تو میں بھی ان کے پاس بٹھا دیا گیا۔ ان مولوی صاحب کا تھوڑا سا حال بیان کر دوں تو شاید میری تربیت کا پتہ چل جائے۔ ان کا نام مولوی واجد علی تھا۔ سن تقریباً چالیس اور پچاس کے درمیان میں رہا ہوگا۔ چھوٹا سا قد، منھ پر کھچڑی داڑھی، تلاوت بڑی روانی سے کرتے تھے، دو روپے مہینہ اور کھانا پاتے تھے۔ ہمارا چھوٹا سا عاقہ کورٹ میں تھا۔ اس لیے عسرت میں بسر ہوتی تھی۔ مگر غرور اور بڑائی کا سامان پھر بھی مہیا تھا۔ جو لڑکے میرے ساتھ کھیلتے تھے، وہ اپنے انداز سے مجھ پر ظاہر کرتے تھے کہ تم امیر آدمی کے بچے ہو۔ ہمارے یہاں سے مولوی صاحب کو تین جوڑے روٹی اور دال دونوں وقت ملتی تھی۔ یہ روٹیاں بہت پتلی اور چھوٹی ہوتی تھیں، دو روٹیاں ان میں سے مولوی صاحب کبوتروں کے لیے توڑتے تھے۔ باقی دس روٹیوں میں جو بیٹھا ہوا اس کو بہ اصرار شریک کر لیتے تھے۔ پیٹ نہ بھرنے کی شکایت جہاں تک یاد ہے کبھی نہ کی۔ نہ کوئی انداز ایسا یاد ہے جس سے یہ بات نکلتی ہو۔ تین مہینے کے روزے رکھتے تھے اور ہر وقت خوش رہتے تھے۔ اس سن میں ہم پڑھتے کیا رہے ہوں گے مگر یہ مجھ کو یاد ہے کہ اکثر کاندھے لگا کر مجھ کو سلا دیتے تھے اور آب دست بھی دے دیتے تھے۔

میری عمر کے ساتویں سال دوسرے مولوی مقرر ہو گئے۔ اس لیے یہ واقعات میری عمر کے چھٹے سال تک کے ہیں۔ ہمارے دادا سنی تھے مگر دادی شیعہ تھیں۔ میرے والد بذات خود شیعہ ہو گئے تھے۔ میرے گھر میں (کم سے کم مردانے میں) تشیع کا رواج کم تھا، کیونکہ نوکر چاکر سب سنی ہی تھے۔ البتہ اندر غوطۂ طہارت، غیر مسلم کے یہاں کی چیز سے احتیاط پورے طور سے تھی۔ مجالس، تعزیہ داری اور دوسرے تمام مناسک جو شیعہ گھروں میں ہوتے ہیں برابر ہوتے تھے، کیونکہ میری والدہ مرحومہ بڑے کٹر شیعہ گھر کی تھیں۔ آٹھویں محرم کو حاضری بھی ہوتی تھی۔ چنانچہ مجھ سے بھی تبرا کہنے کو کہا جاتا تھا۔ مجھ کو خوب یاد ہے کہ میں نے ایک بار انکار کیا۔ میرے یہاں کی عورتوں نے کہا کہ یہ اثر سنی مولوی کا ہے، وہ نکال دیے جائیں۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے اس میں میری سزا کی بھی غرض تھی، کیوں کہ میں مولوی صاحب سے زیادہ مانوس تھا اور لوگ جانتے تھے کہ اس طرح لڑکا دب جائے گا۔ میری سرتابی کی خبر مولوی صاحب تک بھی پہنچی تھی۔ مولوی صاحب کا رویہ میرے دل پر نقش کالحجر ہے۔ مولوی صاحب مجھے گود میں لے لیتے تھے اور پیار کرتے تھے اور کہتے تھے جاؤ بیٹا جو کچھ تمھاری ماں کہتی ہیں کہہ دو۔ پیار کرنے میں ان کی بیچ سے منڈی ہوئی مونچھیں میرے گال پر گڑ جاتی تھیں۔ یہ مجھ کو آج تک خوب یاد ہے اور جو کچھ سمجھاتے رہے ہوں مجھ کو یاد نہیں۔ لیکن اس امر کا پورا یقین ہے کہ انھوں نے تشیع کے خلاف کسی موقع پر کچھ نہیں کہا۔ گو اور لوگ اکثر کہا کرتے تھے کہ ان کے باپ بے تعصب تھے۔ گویا اسی طرح سے شیعیت کے خلاف رجحان دلایا جاتا تھا۔ اس زمانے کے بعد جہاں تک خیال جاتا ہے میں پوری طرح سے

''کلیات چودھری محمد علی رُدولوی'' (جلد دوم) سے ماخوذ، ترتیب و تدوین: مسعود الحق، صفحات 455، قیمت : -/172

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

شیعہ رہا اور مجلسوں میں کمسنی ہی میں بڑا باکی مشہور تھا۔ یہ حالت اس وقت تک ہے۔ خیر اب تو بڑھاپے کی وجہ سے رقّت بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ یہاں تک کہ اکثر باتیں کرنے میں رسول اللہؐ اور امام حسینؑ کا نام بغیر متاثر ہوئے نہیں لے سکتا۔ مگر اس میں بڑا حصہ اعصاب کی کمزوری کا بھی معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال میرے دل میں اہلِ بیت کی محبت ہمیشہ جاگزیں رہی اور آج بھی عقل کی بنا پر بہت ہے۔ گو عقیدت کی بنا پر اس درجے کی نہ ہو تب بھی میں ان حضرات کی دماغی، دلی، وجدانی، نسلی اور روحانی فضیلتوں کا خیال کر کے خوش ہوتا ہوں اور دل کے اندر بحمد للہ ایک کشادگی پاتا ہوں۔

میرے یہاں علاوہ اور مناسکِ عزا کے مہندی بھی اٹھتی تھی۔ جوانی پر پہنچ کر سب سے پہلے اس معاملے میں دلی پریشانی شروع ہوئی، مجالس میں اور یوں بھی شیعہ علما اور پڑھے لکھے حضرات سے سنتا آتا تھا کہ حضرت قاسم کی شادی کی روایت کربلا میں ضعیف ہے۔ ضعیف کے لفظ کے معنی تو جانتا تھا مگر علم حدیث میں اس کے اصطلاحی معنوں سے ناواقف تھا۔ جب معلوم ہوا کہ یہ وہ روایتیں ہیں جن میں اس وقت سے لے کر اس وقت تک تمام راویوں کا سلسلہ ایک طرح کا نہیں تو سمجھ میں آیا کہ یہ ان الفاظ میں سے ہے جن کے لیے بجائے ایک بدنما لفظ کے ایک خوبصورت لفظ استعمال کیا جاتا ہے جیسے آٹھ برس کے گھوڑے کو ''ملے پنچ'' کہتے ہیں۔ کسی بحث میں ضعیف روایت قابل قبول نہیں سمجھی جاتی، مگر ہم مقلدین کو دھوکے میں رکھنے کے لیے کافی ہے۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اس آفت میں جو کربلا میں تھی شادی کیا ہوئی ہوگی۔ مگر اس خیال کو ظاہر کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

ساتویں محرم کو ہمارے یہاں دس بجے رات کو مہندی اٹھتی تھی اور تقریباً دو بجے حصرت عباسؑ کی درگاہ پہنچ جاتی تھی۔ پھر ردولی کے محرم میں ترقی ہو جانے کی وجہ سے ہماری مہندی اکثر صبح ہوتے ہوتے درگاہ پہنچنے لگی۔ لوگوں کی تکلیف، ماتم کی محنت اور اس کے ساتھ یہ بھی ڈر کہ کہیں روشنی کا سامان نہ کم پڑ جائے۔ میں ہمیشہ سے چاہتا تھا کہ لوگ جلدی کریں مگر جوش عقیدت میں میری بات کم مانی جاتی تھی۔ ایک بار ہم گھر اس وقت پہنچے جب صبح کی نماز کا وقت قریب تھا۔ لوگوں نے ہاتھ پانو دھوئے، چائے پی، اتنے میں صبح کی اذان ہوئی۔ گو اس وقت میں نماز کا پابند نہ تھا مگر اہلِ بیت کے کارنامے دل میں حاضر تھے۔ میں نے لوٹے اور تسلے رکھوا دیے کہ مومنین نماز بھی ادا کر لیں۔ مگر ایک صاحب نے بھی یہ نہ کیا۔ ممکن ہے کہ بعض نے گھر پر جا کر پڑھی ہو لیکن میرے یہاں سے مسکرا مسکرا کر سب چلے گئے۔ میری آنکھیں کھل گئیں کہ نماز قائم کرنے کی بہترین مثال کربلا میں ہوئی اور ہم نے گریہ و بکا و ماتم اور عقیدت کے باوجود نماز نہیں پڑھی۔

اب ہمارے وطن کا محرم اور ترقی پکڑ گیا۔ بڑی لمبی مجلسیں، بڑے علمی مذاکرے، منطق کی الٹ پھیر بڑھ گئی۔ مومنین مختلف وجوہ سے مجلسوں میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ مگر رقّت کم ہوگئی، لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ جب تک گریہ و زاری کا خوب شور نہ ہو عموماً ذاکرین پنڈ نہیں چھوڑتے۔ اگر ایک بیتہ ٹکڑے پر رقّت خوب نہ ہوئی تو ذاکر صاحب نے پھر سے تمہید شروع کی اور پھر کوئی بیتہ گوشہ نکالا۔ اس ڈر سے کہ کہیں صاحب پھر سے تمہید نہ شروع کر دیں۔ لوگ ہو ہو کر کے رو پڑتے ہیں، بڑی مجلسوں میں کچھ رونے والوں کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ اکثر تو یہی ہوتا ہے کبھی کبھی کسی ذاکر کی پر جوش تقریر اور واقعی دل سے پڑھنے پر بے اختیار گریہ ہوتا بھی ہے۔ چاہے مجلس تھک گئی ہو اور پریشان ہو کر روے یا واقعی دل سے رونا آئے۔ ہر شخص ختم مجلس پر خوشنودی ہی ظاہر کرتا ہے اور کہتا ہے'' نالِ مجلس'' خوب ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ خیال گزرنے لگا کہ نالِ مجلس رونا کیسے ہوسکتا ہے۔

ایک حدیث بھی بیان کی جاتی۔ "من بکی علی الحسین او بکی و تباکی او جبت له الجنته" اول تو اس کے ترجمے میں منطق کا کمال دکھایا جاتا ہے۔ یعنی ''تباکی'' کے معنی بجائے بہ تکلف رونے کے۔ ''رونے والوں کا سا منھ بنانا'' بیان کیے جاتے ہیں۔ گو دونوں میں فرق ظاہر ہے، لیکن اگر کوئی جرأت کر کے اعتراض کرے تو جواب موجود ہے کہ ''منھ بنانے میں بہ تکلف رونا تو ہوتا ہی ہے۔'' (قربان جایئے اس منطق کے) علاوہ اس کے پڑھے لکھے لوگوں نے مجھ کو بصیغۂ راز بتایا بھی ہے کہ یہ حدیث کسی معصوم تک پہنچتی بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی شیعہ صاحب اس معاملے میں میری تسکین کر دیں تو انشاء اللہ عند اللہ ماجور ہوں گے اور یہ ناچیز بھی ہدیۂ تشکر پیش کرے گا۔

نالِ مجلس اہل بیت کی پیروی اگر کی جائے تو ایک بات بھی ہے۔ خود رونا نالِ مجلس کیسے ہوا؟

جس وقت مصائب اہل بیت سن کر گریہ گلوگیر ہوتا ہے تو پڑھے لوگ پکار اُٹھتے ہیں "یٰلَیْتَنِی کُنْتُ مَعَهُمْ فَافُوزَ فَوزاً عَظِیْماً" چنانچہ میں بھی یہی کرتا تھا اور اپنے زعمِ ناقص میں دل سے کرتا تھا۔ حقائق کی ستم ظریفی دیکھیے یہ آیت قرآن پاک میں کس موقع پر آئی ہے۔

جب پہلی عالمگیر لڑائی شروع ہوئی اور عراق بھی انگریزوں کے قبضے میں آ گیا تو میں نے محسوس کیا کہ بھئی "یٰلَیْتَنِی" ہم کہتے تو ہیں مگر جی میں دوسری ہی بات ہے۔

کربلا، نجف، کاظمین، سامرہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے اور ہم چپ رہے۔ ہم سے جب چھوٹی چھوٹی قربانیاں نہیں ہوسکتیں تو کربلا کی قربانیاں کیسے ہوتیں۔ دل نے کہا'' محمد علی ہیز ہو، نامرد ہو، جب تم جانتے ہو کہ

یہ قربانیاں تم سے نہیں ہوسکتیں تو فضول اپنے نفس کو دھوکا دینے کے لیے "یالیتنی" کیوں کہتے ہو۔ اگر تم امام حسینؑ کی تاسی کرو تو مواقع آج بھی موجود ہیں مگر تم سے نہیں ہوتا۔ پھر یہ جھوٹ موٹ کیا ہوا باندھتے ہو بجائے یالیتنی کہنے کے حاضر و ناظر، سمیع و بصیر خدا کے آگے شرمندہ ہو۔ اتنا بڑا جھوٹ اپنے نامۂ اعمال میں لکھوا رہے ہو۔ خیر تم سے قربانی کہاں ہوگی۔ اور تاسی کیا ہوگی۔ یہی بے ایمانی چھوڑ دو کہ "یالیتنی" کہتے ہی شرمایا کرو۔ چنانچہ برسہابرس ہوگئے یہ بڑی بات اس چھوٹے سے منھ سے نہیں نکلی۔

گو میں انتہائی کوشش کر رہا ہوں کہ اپنے دل کی صحیح کیفیات نکال کر آپ کے آگے رکھ دوں مگر یہ سہل کام نہیں ہے۔ آدمی اپنے زعمِ ناقص میں واقعہ بیان کرتا ہے مگر نفس نقاب کے اندر نقاب اور اس کے اندر نقاب ڈالے بہروپیا بنا بیٹھا رہتا ہے اور لکھنے والا خود دھوکا کھا جاتا ہے۔

ہیں خواب ہی میں جو ابھی جاگے ہیں خواب سے

اس لیے پڑھنے والوں سے گزارش ہے کہ میرے اعتراف کو ایک پلّے میں رکھیں اور اپنے نفس اور خیالات کو دوسرے پلّے میں اور پھر اندازہ کرلیں۔ اگر میرا والا پلّہ ہلکا ٹھہرے تو بجائے مجھ سے نفرت کرنے کے ازراہِ ترحم میرے لیے ہدایت اور مغفرت کی دعا مانگیں۔

بہرحال سنیے۔ میرے ایک ہم وطن کے یہاں مجلس تھی۔ میں بھی شریک مجلس تھا۔ ذاکر صاحب نے منبر پر پہنچ کر مجھے قریب منبر بیٹھنے کی دعوت دی۔ اس کے بعد لڑکیوں کو انگریزی اسکولوں میں پڑھانے اور بورڈنگ ہاؤس میں رکھنے پر اعتراضات جڑے۔ جہاں تک خیال پڑتا ہے اس وقت میری ہی لڑکیاں الہٰ آباد یا لکھنؤ کے اسکولوں میں پڑھنے گئی تھیں۔ اس بات کو حاضرین میں سے سب نے محسوس کیا کہ ذاکر کا روئے سخن میری ہی طرف تھا اور اسی دن سے ان کی مجلس اور تقریروں کے سننے کے وقت میرا نفس ہمیشہ شریک رہا۔ میرے دل نے کہا۔ ذاکر صاحب کا یہ مطلب ہوگا کہ اگر اس نے (یعنی میں نے) بانی مجلس سے لڑائی کرلی تو بھی اچھا ہے اور اگر یہ کہا بدا تو بھی ایک ملحد کو خوب ذلیل کیا۔ میں نے یہ خیال کیا کہ اگر بانی مجلس سے لڑ گیا تو جو شخص مجھ سے خار کھاتا ہے اس کو خوشی ہوگی۔ میرے وطن کے حضرات اہل سنت الگ خوش ہوں گے کہ شیعوں میں خوب تفرقہ پڑا۔ اس لیے میں پی گیا۔

ان ذاکر صاحب سے مجھ سے چشمک کیوں تھی؟ شروع جوانی سے میرے خیالات صرف ملحدانہ نہیں بلکہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ بالکل دہریت کے تھے اور منھ پھٹ بھی ہمیشہ کا تھا۔ آدمی کی طبیعت عجیب گورکھ دھندا ہے۔ میرے خیالات مل ہربرٹ اسپنسر اور اسی طرح کے دوسرے مصنفین کی کتابیں پڑھ کر دہریت کے ہوگئے تھے۔ مگر بچپن کی تربیت کی وجہ سے باوجود بہت سے شکوک کے پھر بھی شیعوں کا صرف ہمدرد ہی نہیں تھا بلکہ شیعوں کو جادۂ مذہب سے ہٹا ہوا بھی نہیں سمجھتا تھا۔ تبرّا ہمیشہ خلاف طبیعت رہا اور شروع شروع اگر کہا بھی تو جی کے اندر شرمندہ سا ہوا۔

اس کے سمجھانے کے لیے ایک دوسرا قصہ بیان کرنا پڑے گا۔ مولانا کرامت حسین صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ بیرسٹر اور سابق جج الہٰ آباد ہائی کورٹ جنھوں نے اپنی عمر کی پوری کمائی لگا کر کرامت حسین مسلم گرلز کالج قائم کیا تھا، جو آج تک لکھنؤ میں ہے، بڑے ذی علم تھے۔ ان کی تصانیف قانون و اخلاقیات کے اوپر ایسی تھیں کہ امریکن اخباروں نے جہاں نہ مروت کا سوال تھا نہ سفارش کا، ان کی تعریف میں لکھا ہے کہ "ان کو پڑھ کر جرمی بنتھم اور آسٹن یاد آجاتے ہیں۔ جب ان کا انتقال ہوا تو لوگ ان کی نماز جنازہ پڑھنے سے رکتے تھے۔ ان کے چچازاد بھائی مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ نے پڑھائی۔ یہ بزرگ بڑے فلسفی بھی تھے اور ہربرٹ اسپنسر کے ماہر تھے۔ میں بھی ان کے قدموں سے لگا رہا اور یہ زمانہ میری عقل و دماغ کی صیقل کا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد میں نے ایک مختصر رسالہ "یادگار کرامت حسین مرحوم" کے نام سے لکھا جس میں بعض باتیں سخت لکھ دیں اور میں بھی لاادریت کا خطاب پا گیا اور شرمندہ نہ ہوا۔ شیعہ عموماً مجھ سے خفا ہوگئے مگر میں آزاد خیالی پر فخر و مباہات ہی کیا کیا۔ اگر کھاتے پیتے گھر کا آدمی نہ ہوتا تو شاید دوسروں کے ڈر سے اپنے خیالات کا اشتہار نہ دیتا۔

میرے ایک دوست یکرنگ اور بڑے قابل آدمی شیخ ولایت علی قدوائی مرحوم تھے۔ ان کی صحبت میں یہ باتیں اور چمک اٹھیں اور دوسرے پہلو سے بھی میرے اوپر ان مرحوم کا بہت اثر ہوا۔

شیعہ لوگوں کا رجحان یوں ہی ارسٹا کریسی کی طرف مائل ہے اور پھر میری تربیت بھی کالون تعلق دار اسکول (جواب کالج ہے) میں ہوئی تھی جس سے اس قسم کے خیالات اور مضبوط ہوگئے تھے۔ ولایت علی مرحوم کی صحبت میں مجھ کو ڈیما کریسی کی خوبیاں معلوم ہونے لگیں۔ خیالات جو بچپن سے انگریز پرستی کی طرف راغب تھے ان میں فرق آنے لگا۔ لیکن جائداد سے محروم ہونے کا دھڑکا اور آرام کی زندگی بسر کرنے کے بعد تکلیف کا خوف۔ یہ چیزیں پالیٹکس کے میدان میں انگریزوں کے خلاف آنے سے روکتی رہیں۔ پھر بھی گورنمنٹ خوشامدیوں میں میرا شمار کبھی نہیں ہوا۔ گو میرا مدعا صرف اپنی مذہبی ارتقا کا بیان کرنا ہے مگر ایک واقعہ عرض کرتا چلوں جس سے شاید میری افتاد طبیعت کا پتہ چل سکے۔

ایک انگریز ڈپٹی کمشنر میرے بڑے دوست تھے۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا "میں تمھارا بہی خواہ ہوں اور تمھارے لیے میں نے ایک کام تجویز کیا ہے

جس میں تم کو بڑے بڑے فائدے ہوں گے اور وہ یہ ہے کہ جو باتیں تم دوسروں کو کرتے سنو اس کی رپورٹ ہم کو دیا کرو۔'' میں نے کہا: ''دوستی کی آڑ لے کر اور باتوں باتوں میں آپ مجھ سے سب کچھ پوچھ سکتے ہیں کیونکہ مجھ کو راز رکھنے کی حکمت ہی معلوم نہیں۔ لیکن اگر ارادتاً آپ کو اس قسم کی رپورٹیں دوں گا تو پھر میرا دل مجھ کو اس قدر برا کہے گا کہ میں شاید سو نہ سکوں۔'' وہ مجھ سے بہت مایوس ہوئے اور دوسرے ہی دن ایک صاحب کو اسی خدمت کے لیے مامور کر دیا۔ ان کو ہزار روپے کی معافی ملی۔ خان بہادر ہوئے اور دوسرے اعزاز بھی ہاتھ آئے۔ اس قصے سے شاید میرے پڑھنے والوں کو کچھ پتہ چل گیا ہوگا کہ مذہب کے مقابلے میں بھی دل میں کچھ اور منہ میں کچھ اور مجھ سے کبھی بن نہ پڑا تھا۔

دوسرے ذاکرین جو میرے قصبے میں مجلس پڑھنے کے لیے آیا کیے وہ بھی مجھ کو اسی حقارت کی نظر سے دیکھا کیے۔ میرے قصبے کے ایک صاحب، جن سے مجھ سے کافی یگانگی اور خلوص تھا اور جو باوجود مراسم کے میرے مذہبی خیالات کو برا سمجھتے تھے، ہنسی کے پیرائے میں ایک دن میرے عقائد پر اعتراض کرنے لگے۔ کچھ تعزیہ داری کا ذکر تھا مجھ کو تاؤ آ گیا اور میں نے بھی سختی سے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا۔ اس وجہ سے ان سے تو ملال ہو ہی گیا مگر اسی دن سے کم و بیش میرے عقائد دوسروں پر کھل گئے۔

□□□

صنعتی تنظیم اور انتظام

مصنف: محمد احترام اللہ

آج کے صارفی سماج میں انتظامی شعبے کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ایک کامیاب منتظم حال پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی بھی کرتا رہتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف بی.کام کے طالب علموں کی ضرورت کو پوری کرتی ہے بلکہ علم دوست اردو قاری کو بھی جدید صنعتی شعبے اور معیشت کے دیگر رموز سے آگاہ کرتی ہے۔

صفحات: 606، قیمت -/149 روپے

دکنی نثر کا انتخاب

مرتبہ: سیّدہ جعفر

دکنی نثر کا یہ انتخاب دکن میں اردو نثر کی ابتدا سے فورٹ سینٹ جارج کالج کے زمانے تک کے مصنفین کا احاطہ کرتا ہے اور ان کی تصانیف کے نمائندہ منتخبات پر مشتمل ہے۔

صفحات: 168، قیمت -/45 روپے

ہندوستان کا صنعتی ارتقا

مصنف: ڈاکٹر ڈی. آر. گیڈگل، پروفیسر ایم. صدیقی

ہندوستان کی تاریخ میں 1857 ایک اہم سنگ میل ہے۔ اس سال نہ صرف ملک پر پوری طرح سے انگریز قابض ہو گئے بلکہ اس کے بعد ہندوستانیوں کی خود احتسابی کا دور بھی شروع ہوا جس کے نتیجے میں مختلف اصلاحی تحریکات وجود میں آئیں اور ملک نشاۃ الثانیہ سے ہم کنار ہوا۔ 1857 کے بعد سے وہی صحیح معنوں میں ہندوستان کی صنعتی ترقی بھی شروع ہوئی۔ اس کتاب میں 1860 سے 1939 تک ملک کے صنعتی ارتقا کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 343، قیمت -/130 روپے

شمس الرحمٰن فاروقی (ہماری مطبوعات سے)

کسی تہذیب کے معیار کسی دوسری تہذیب کے معیاروں پر فوقیت نہیں رکھتے

بعض لوگوں کو اب بھی اس معاملے میں تردد ہے کہ ہمیں اپنی کلاسیکی شعریات (اگر ایسی کوئی شے ہے بھی) کی روشنی میں اپنا ادب پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس تردد کی تہ میں جو اصل سوال مضمر ہے وہ یہ ہے کہ ادب کے معیار آفاقی ہیں یا مقامی؟ یعنی کیا ہر ادبی تہذیب اپنے معیار خود مقرر کرتی ہے یا اسے ایسے معیاروں کی پابند ہونا چاہیے جو عالمی اور آفاقی؟ اگر ہر ادبی تہذیب کو مبینہ عالمی معیاروں کی روشنی میں عمل پیرا ہونا چاہیے، تو یہ معیار کس تہذیب نے مرتب کیے ہیں؟ یا کیا کوئی عالمی ادبی پارلیمنٹ ہے جس نے باتفاق رائے (یا کثرت رائے سے) ان معیاروں کو مرتب اور نشر کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ کوئی ایسی تہذیب، یا کوئی ایسی عالمی پارلیمنٹ نہیں ہے، اور نہ ہو سکتی ہے، جس کے احکامات سب پر چلتے ہوں، یا چل سکتے ہوں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ گذشتہ برسوں سے جن معائیر و اصول کو ہم آفاقی سمجھتے رہے ہیں وہ دراصل مغرب سے حاصل کیے گئے ہیں (یا ہم انھیں مغرب سے حاصل شدہ سمجھتے ہیں۔) بے شک یہ معیار و اصول بہت محترم اور موقر ہیں۔ ہم نے ان سے بہت قیمتی سی باتیں سیکھی ہیں اور آئندہ بھی سیکھتے رہیں گے (خاص کر طریق کار کے میدان میں)، لیکن یہ بات بالکل واضح طور پر کہہ دینے کی ہے کہ کسی تہذیب کے معیار کسی دوسری تہذیب کے معیاروں پر فوقیت نہیں رکھتے۔ سب اپنی اپنی جگہ پر صحیح اور درست ہیں۔

اگر کسی تہذیب کے ادبی معیار کسی دوسری تہذیب کے ادبی معیاروں سے متناقض ہوں، تو دوسری تہذیب کے اصول و معیار کو ثانوی حیثیت ملے گی۔ مثلاً اگر ہمارے یہاں غزل کے اندر کوئی داخلی یا ظاہری ربط، یا ارتقائے خیال، ضروری نہیں اور اگر کسی اور تہذیب کے معیاروں کی رو سے نظم اسی وقت کامیاب ہے، جب اس کے مختلف حصوں میں ربط اور ارتقائے خیال ہو، تو غزل کی حد تک ہم اپنے اصول کو فوقیت دیں گے، غیر تہذیب کے اصول کو نہیں۔ اسی طرح، اگر ہمارے یہاں شعر میں ''ذاتی جذبہ، اور ذاتی تجربہ، اور اپنے آپ پر گزرے ہوئے معاملات'' کو بیان کرنا ضروری نہیں، اگر ہمارے یہاں عشقیہ شاعری کے لیے ضروری نہیں کہ شاعر ''آپ بیتی'' یا کم سے کم اپنے ''ذاتی یا داخلی'' کوائف بیان کرے، تو ہماری عشقیہ شاعری کی حد تک یہ اصول کسی دوسری تہذیب کے اس اصول پر فوقیت رکھے گا، جس کی رو سے عشقیہ شاعری میں شاعر کے ''ذاتی اور داخلی'' کوائف بیان ہونا ہماری کلاسیکی تہذیب کی رو سے شاعر کا بڑا کمال یہ نہیں ہے کہ وہ بالکل ''طبع زاد'' یعنی مولک یا (Original) ہو، بلکہ اس کا کمال یہ ہے کہ مضامین (جو پہلے سے موجود ہیں، یا جنھیں ہم پہلے سے موجود فرض کرتے ہیں) کو نئے رنگ سے، یا پہلے سے بہتر ڈھنگ سے پیش کرے، تو اس پر ''چبائے ہوئے نوالے نگلنے، اور'' چچوڑی ہوئی ہڈیوں کو دوبارہ چچوڑنے'' کی کوشش کا الزام نہ صرف غلط ہے، بلکہ مضمون آفرینی کے بنیادی اصولوں سے بے خبری کا بھی غماز ہے۔

واضح رہے کہ مولک پن یا (Originality) کا یہ تصور، کہ ہر شاعر دوسرے شعرا سے لازماً مختلف ہو، انیسویں صدی کا مغربی رومانی تصور ہے اور مشرقی تصور تخلیق و تخیل سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ عربی شعریات میں مضمون آفرینی کا تصور بہت ترقی یافتہ نہیں، لیکن وہاں بھی شیخ عبدالقاہر جرجانی ''سرقہ'' کے اس تصور سے بے گانہ نظر آتے ہیں جو ہمارے یہاں انیسویں صدی میں عام ہوا۔ عبدالحسین زریں کوب نے جرجانی کے نظریے کو یوں بیان کیا ہے کہ سرقہ اسی وقت قائم ہوتا ہے جب کوئی شاعر بہت سوچنے اور کوشش اور تامل کے باوجود وہی بات کہے جو دوسرے کہہ گئے ہیں۔ جرجانی کہتے ہیں اگر دو شاعروں میں اتفاق معنی (= مضمون) ہو تو یہ دو صورتوں سے خالی نہ ہوگا۔ یا تو دونوں ''غرض'' میں متفق ہیں (مثلاً دونوں اپنے مربی کی مدح کر رہے ہیں)۔ ایسی صورت میں سرقے کا سوال نہیں۔ پھر یہ ہو سکتا ہے کہ دونوں میں ''طریق دلالت'' کا اتفاق ہو (مثلاً دونوں اپنے ممدوح کو سخاوت میں دریا، دلاوری میں شیر، وغیرہ قرار دیں۔) ایسی صورت میں اگر یہ ظاہر ہو کہ ان میں سے کسی ایک شاعر نے یہ مضمون ''سعی و جہد و تامل'' کے بعد حاصل کیا ہے (یعنی وہ بہت کوشش کے بعد بھی وہیں پہنچے جہاں دوسرا پہنچ چکا ہے،) تب ہی اس پر سرقت و

''شعرشور انگیز'' (جلد چہارم) سے ماخوذ، مصنف: شمس الرحمن فاروقی، صفحات۔ 764، قیمت : -/247

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

انتحال'' کا حکم ہوسکتا ہے۔ یعنی جرجانی کی نظر میں سرقہ کوئی اہم بات نہیں، قوت متخیلہ کی ناکامی البتہ اہم بات ہے۔

شمس قیس رازی نے سرقہ و استفادہ کو انتحال، المام، سلخ اور نقل کی چار قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ''نقل'' سے ان کی مراد چربہ یا (Copy) نہیں، بلکہ مضمون کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا ہے۔ انھوں نے جو مثالیں دی ہیں، اور ان پر جس طرح اظہار خیال کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ نقل کو قابل ستائش سمجھتے ہیں۔ بعد میں ہمارے یہاں شمس قیس رازی کی انواع کو اور بھی تاریک اور لطیف طریقے سے سرقہ، توارد، ترجمہ، اقتباس، اور جواب کے زیرعنوان جگہ جگہ بیان کیا گیا۔

سنسکرت شعریات میں جرجانی سے بھی پہلے آنندوردھن نے، اور پھر راج شیکھر نے ان معاملات پر بہت عمدہ بحث کی ہے۔ مکندلاتھ کا کہنا ہے کہ ان دونوں مفکروں کی نظر میں ''نیا اس وقت وجود میں آتا ہے جب قوت متخیلہ کے ذریعے پرانے کی تعمیرنو کی جائے۔'' قدیم سنسکرت شعریات میں ایک مکتب کا خیال تھا کہ شعر میں نئی بات کہنا ہی ممکن نہیں، کیوں کہ شاعری (VuqHkko;kuqHkolkeu;e) کا اظہار کرتی ہے۔ مکندلاتھ نے اس کا ترجمہ Universals experience کیا ہے۔ چونکہ یہ آفاقی حقائق تعداد میں محدود اور تمام انسانوں میں بہرزمان و بہر وقت مشترک ہیں، اس لیے پرانے لوگوں نے انھیں پہلے ہی بیان کردیا ہے۔ لہٰذا اب نئے کہنے والوں کے لیے بچا ہی کیا ہے؟ (اس کا جواب آنندوردھن نے یہ دیا کہ جب نیا لفظ ہوگا تو نیا مضمون اور نئے معنی بھی ہوں گے۔ (کیا عجب کہ طالب آملی کا مشہور قول ''لفظے کہ تازہ است بہ مضموں برابر ست'' پنڈت راج جگن ناتھ کے واسطے سے آنندوردھن کے یہاں سے حاصل ہوا ہو؟) لہٰذا پرانی بات کو نئے الفاظ میں بیان کرنے سے بات بھی نئی ہوجاتی ہے۔

آنندوردھن اور راج شیکھر نے مضمون آفرینی کے بارے میں جو لطیف بحثیں کی ہیں، ان کو آئندہ کے لیے چھوڑتا ہوں۔ بس یہ عرض کرنا ہے کہ ان نکات پر گفتگو کرتے وقت خود مکندلاتھ نے ''اردو فارسی ادب کی مشہور اصطلاح'' ''مضمون کا ذکر کیا ہے اور انھوں نے ''مضمون'' کا ترجمہ (Theme) یا (Substance) کیا ہے، جو بالکل درست ہے۔ لطف یہ ہے کہ حالی کو عربی فارسی شعریات کے حوالے سے ان باتوں کا شعور تھا۔ چنانچہ وہ ابن خلدون کا قول نقل کرتے ہیں کہ ''معانی صرف الفاظ کے تابع ہیں اور اصل الفاظ ہیں۔ معانی ہر شخص کے ذہن میں موجود ہیں، ضرورت ہے تو صرف اس بات کی ہے کہ ان معانی کو کس طرح الفاظ میں ادا کیا ہے۔'' (ابن خلدون کا یہ قول براہ راست جرجانی سے مستعار ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ جرجانی اور آنندوردھن نے ایک ہی مکتب میں تعلیم پائی تھی۔)

برٹرنڈ رسل (Bertrand Russell) نے جب چین جاکر وہاں کی تہذیب اور روایات کا براہ راست مطالعہ کیا تو اس کو یہ جان کر حیرت اور مسرت ہوئی کہ مولک پن (Originality) کا تصور صرف وہی ایک ہی نہیں ہے جو مغرب میں رائج ہے، بلکہ مولک پن (Originality) کے معنی یہ بھی ہیں کہ پرانی بات کو نئے انداز میں دہرایا جائے۔ رسل کو محسوس ہوا کہ چینی تصور انشا بھی اپنی جگہ پر درستگی کا حامل ہے، اور ممکن ہے کہ یہ مغربی تصور سے بہتر بھی ہو۔ (1) لیکن آزاد، حالی اور امداد امام اثر اور ان کے متبعین کو مشرقی تصور انشا میں عیب ہی عیب نظر آتے تھے۔ سچ ہے، شکست خوردہ تہذیب سب سے پہلے فاتح تہذیب پر عاشق ہوتی ہے۔ اس اصول کو ہیری لیون (Harry Levin) نے ''اقلیتی طبقے کی اپنے آپ سے نفرت'' (Self-Hatred) سے تعبیر کیا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم لوگ ابھی تک اس خودنفرینی (Self-hatred) سے آزاد نہیں ہوئے ہیں، او رآج بھی ہم اپنے بیش تر ادبی سرمائے پر شرمندہ ہیں، یا اسے لائق اعتنا نہیں سمجھتے۔

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری کلاسیکی شاعری کے پیچھے ایک واضح شعریات (=تنقیدی تصورات جن کی روشنی میں کوئی متن فن پارہ کہلاتا ہے، اور جن کی روشنی میں فن پارے کی خوبیاں متعین ہوتی ہیں) موجود ہے۔ اور اس کو جاننا اس لیے ضروری ہے کہ جب تک ہم یہ نہ جانیں گے کہ ہمارے قدما جب شعر کہتے تھے تو کس طرح یہ طے کرتے تھے کہ جو متن وہ بنا رہے ہیں، وہ شعر ہے؟ اور اس متن کو سننے پڑھنے والے کس طرح معلوم کرتے تھے کہ جو چیز ہمارے سامنے پیش کی جارہی ہے، وہ شعر ہے کہ نہیں؟ اس وقت تک ہم کلاسیکی شاعری سے پوری طرح لطف اندوز نہ ہوسکیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمام تخلیقی ادب اصلاً ایک ہے۔ لہٰذا اس شعریات کا بڑا حصہ تمام ادبی کارگزاری (وہ نثر ہو یا نظم) کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ مرثیے کو سمجھنے میں کلیم الدین احمد اور اسلوب احمد انصاری، اور داستان کو سمجھنے میں کلیم الدین احمد، وقار عظیم اور گیان چند سے جو مسامحے ہوئے وہ اسی وجہ سے کہ یہ لوگ کلاسیکی غزل کی شعریات سے ناواقف تھے۔ ورنہ ''ہومان نامہ'' (مصنف احمد حسین قمر) کا یہ سرسری بیان بھی ان بزرگوں کی بہت سی مشکلات کو حل کرنے کے لیے کافی تھا:

صاحب قراں بھی بے قرار ہوکر رو رہے ہیں فرماتے ہیں کہ اے نورنظر شعرا کے کلام کا کیا اعتبار ہے ان مضامین پر خیال کرنا سراسر بے کار ہے شاعر کو یہ خیال رہتا ہے کہ تکلفات لفظی ہوں خواہ مذہب رہے خواہ جائے جو مضمون سامنے آگیا وہ نظم کردیا، پڑھنے والا اس کے تکلفات کو دیکھے، مضمون کا اس کے اعتبار نہ کرے (صفحہ 694)۔

موقع اس کلام کا یہ ہے کہ لشکر اسلام کے بادشاہ قباد کو آئینے میں اپنا حسن و جمال دیکھ کر خیال آیا ہے کہ زندگی چند روزہ ہے۔ ''اپنے جمال کو دیکھ کر محو ہوگئے دل سے کہتے ہیں مقام افسوس ہے کہ یہ صورت ایک دن خاک میں مل جائے گی، اے قباد اس سلطنت میں تم سے بڑے بڑے ظلم ہوئے، وہ عادل جو پوچھے گا تو کیا جواب دوگے۔ یہ سوچ کر آئینہ خانے سے حیران و پریشان روتے ہوئے نکلے۔'' پھر جب صاحب قراں (امیر حمزہ) نے اس رنج کا سبب پوچھا تو قباد نے بے ثباتی دنیا کے مضمون پر چند شعر پڑھے۔ اس کے جواب میں امیر حمزہ کی وہ تقریر ہے جو میں نے اوپر نقل کی۔ اس کلام میں دو اہم ترین نکتے ہیں شاعری کی اہمیت اس کی قدر حقیقت (Truth Value) کی بنا پر نہیں بلکہ لفظی محاسن کی بنا پر ہے۔ شاعر کا کام مضمون تلاش کرنا اور نظم کرنا ہے، خواہ اس میں تعلیم و موعظت کا پہلو ہو یا نہ ہو۔ یہاں یہ کہنے سے کام نہ بنے گا کہ داستان گو صاحبان تو ''زوال پذیر'' اقدار کے نمائندے تھے، ان کی بات کا کیا اعتبار؟ داستان گویوں کی اقدار کو ''زوال پذیر'' تو ہم آپ کہتے ہیں، کیوں کہ ہمیں انگریزوں نے یہی سکھایا ہے، ورنہ بزعم خود وہ لوگ تو اپنی بہترین اقدار کے غالباً آخری پاسدار تھے۔ دوسری بات یہ کہ احمد حسین قمر نے امیر حمزہ سے جو بات کہلائی ہے، اس کی عملی صورت ہم اپنی کلاسیکی شاعری میں دیکھ سکتے ہیں۔ ممکن ہے آپ میر کے زمانے کو مغلوں کے زوال (اور اس لیے ہند+اسلامی تہذیب کے زوال) کا زمانہ کہیں، لیکن ولی یا نصرتی یا وجہی کے زمانے کو تو ایسا نہیں کہہ سکتے۔ وجہی نے اپنی مثنوی ''قطب مشتری'' (زمانۂ تحریر 1609) میں شاعر بننے کا شوق رکھنے والوں کو کچھ نصیحت کی تھی۔ اس کا مختصر تجزیہ مسیح الزماں کی کتاب میں ہے۔ اشعار یوں ہیں

رکھیا ایک معنی اگر زور ہے   معنی=مضمون
دلے بھی مزا بات کا ہو رہے
اگر خوب محبوب جوں سور ہے   سور=سورج
سنوارے تو نورٌ علیٰ نور ہے
اگر لاکھ عیباں اچھے نار میں   اچھے=ہوں
ہنر ہو دے خوب سنگار میں

اس سے بھی کچھ پہلے شیخ احمد گجراتی اپنی مثنوی ''یوسف زلیخا'' (زمانۂ تحریر 1580-1588) میں اپنی صفت یوں بیان کر چکے ہیں:

جتے اصناف ہوں گے شعر کیرے   کیرے=کے
کہن مشکل نہیں نزدیک میرے
خیال و خاص طرزاں خاص لیاؤں
غرائب ہور بدائع لیا دکھاؤں
سہہ معنی مرے بھی اونچ اچپل   سہہ=مبارک۔ اچپل=شوخ،
جو نور آکاس دیسیں بیچ اس گل   دیسیں=دکھائیں
اگر تمثیل کے عالم میں آؤں
بن اس عالم نوا عالم دکھاؤں   بن=بجائے۔ نوا=نیا
کبھی نرجیو کوں جیو دے چھڑاؤں
کبھی جیو جیوتی کا جیو اڑاؤں
کبھی دھرتی کوں انبر کر اچاؤں   اچاؤں=بلند کروں
کبھی انبر کوں دھرتی کر بچھاؤں

یہ لوگ تو اپنی روحانی اور مادی اقدار کے عروج پر متمکن ہیں، لیکن ان کے بیان میں وہی روح بول رہی ہے جو ''ہومان نامہ'' کے الفاظ میں ہے۔ یہ کہنا محض زیادتی ہے کہ ان میں ''زوال آمادہ'' اقدار منعکس ہیں، اور ان کی روشنی میں ہمارے کلاسیکی شعر کو نہ پڑھنا چاہیے۔ جس کام کے جو اصول ہیں، اور جن کی روشنی میں وہ کام معنی خیز ہوتا ہے، ان سے صرف نظر کریں تو تاریکی ہی تاریکی ہے۔

□□□

بہادری کے کارنامے

مصنف: منوج داس / مترجم: ایس۔ایم۔احمد

ہمارے ملک کو انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے لاتعداد قربانیاں دینی پڑی ہیں۔ جن سورماؤں نے اپنی جان آزادیِ وطن کے لیے نچھاور کی، ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں جدوجہد آزادی کے ابتدائی دور کے ایسے ہی بہادر سپوتوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

صفحات: 83، قیمت -/25 روپے

اردو خبر نامہ

ملک کے عظیم گنگا جمنی ورثے کی حفاظت ضروری

● نئی دہلی۔ 13 اگست، نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ گذشتہ کئی دہائیوں میں اردو ادب میں گہما گہمی کم ہوئی ہے اور ادیبوں و دانشوروں سے اپیل کی کہ اس عظیم گنگا جمنی ورثے کو محفوظ رکھنے اور اس کی ترقی کے لیے سرگرم عمل ہوں۔ آج یہاں ایک پروقار تقریب میں کلیات عوض سعید کی رسم اجرا ادا کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ایک زمانہ تھا کہ حیدرآباد اردو ادب کا گہوارہ تھا لیکن آج حیدرآباد میں اردو کا چلن کم ہوتا جارہا ہے۔ اس تقریب میں راجیہ سبھا کے ڈپٹی چیئرمین کے رحمان خاں کے علاوہ ممتاز نقاد گوپی چند نارنگ، نامور ادیب و شاعر زبیر رضوی، راجیہ سبھا کے ممبر احمد سعید ملیح آبادی، دلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین کمال فاروقی، جامعہ ملیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی، سماجی کارکن نوید حامد شریک تھے۔

نائب صدر جمہوریہ نے مرحوم عوض سعید کے فرزند ڈاکٹر اوصاف سعید کی جو وزارت خارجہ میں جوائنٹ سکریٹری کے عہدے پر مامور ہیں ستائش کرتے ہوئے کہا کہ کلمات کو منظر عام پر لانے میں ایک لائق فرزند نے اپنے نامور والد کے ادبی سرمائے کو اردو دانوں تک پہنچایا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے عوض سعید کی ادبی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان کی تخلیقی دنیا کافی وسیع تھی۔ وہ شاعر بھی تھے، ڈراما نویس بھی اور خاکہ نویسی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان کی کہانیاں سماج کی گھٹن کی نشاندہی کرتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نفسیاتی کشمکش، خوف اور ہمزاد کا تصور ان کے افسانوں میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ عوض سعید کے خاکوں کی اپنی اہمیت ہے۔

زبیر رضوی نے کہا کہ عوض سعید تخلیقی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ کم گو تھے لیکن اپنی کم گوئی کا خلا انھوں نے اپنے افسانوں، ڈراموں اور خاکوں سے پر کیا۔ انھوں نے 200 سے زائد کہانیاں لکھیں۔ ڈاکٹر اوصاف سعید نے اپنی مختصر تقریر میں اپنے والد بزرگ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 1949 میں ''جیتے جاگتے'' کے عنوان سے ایک افسانہ لکھ کر کیا جو نظام، لاہور میں شائع ہوا۔ انھیں مطالعے کا بہت شوق تھا۔ انھوں نے کہا کہ عوض سعید کے بکھرے ہوئے ادبی سرمائے کو یکجا کرنے اور اس کی ترتیب و تدوین میں جن لوگوں نے مدد کی ہے میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

(اخبار مشرق، نئی دہلی)

ایک شام دوستی کے نام

● نئی دہلی۔ 25 اگست، احمد فراز ہندوستان اور پاکستان ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں یکساں مقبولیت اور شہرت رکھتے تھے۔ احمد فراز کا نام ہندوستان اور پاکستان کے درمیان رفاقت، دوستی، محبت اور ہم آہنگی کی ایک علامت بن گیا تھا۔ ان خیالات کا اظہار معروف دانشور اور نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے آج فاؤنڈیشن آف کلچر اینڈ لٹریچر اور سانجھے رنگ کے زیراہتمام تین مورتی آڈیٹوریم میں احمد فراز کی پہلی برسی کے موقع پر ''ایک شام دوستی کے نام'' کے عنوان سے منعقد تقریب کے دوران کیا۔

پدم بھوشن پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ کسی بھی شاعر کا بہترین تعارف اس کا کلام ہوتا ہے، باقی جو کچھ ہم شاعر کے بارے میں کہتے ہیں وہ محض لفاظی ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس شہر میں فراز کے چاہنے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہے اور مجھے خوشی ہے کہ دہلی والوں کو ان کی یاد آئی۔ انھوں نے کہا کہ بیسویں صدی میں پاکستان کے تمام بڑے شاعروں کی مادری زبان پنجابی تھی لیکن احمد فراز کی زبان پشتو تھی اس کے باوجود انھوں نے اردو میں ایسی شاعری کی جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے اس موقع پر فیض احمد فیض اور احمد فراز کی شاعری کا موازنہ بھی کیا اور کہا کہ یہ دونوں ہی ایسے شاعر تھے جنھیں ان کی زندگی میں ہی بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ آئی سی سی آر کے وائس چیئرمین سید شاہد مہدی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ احمد فراز کلاسیکل ٹریڈیشن کے منفرد شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے اشعار کے ذریعے ناانصافی، سماجی نابرابری اور برائیوں کے خلاف آواز بلند کی۔ ان کی شاعری میں سومانیت کے ساتھ ساتھ مزاحمت بھی ہے اور احتجاج بھی۔ انھوں نے کہا کہ احمد فراز محض انڈو پاک نہیں بلکہ پوری دنیا میں مقبول تھے۔ اس موقع پر پاکستان ہائی کمیشن کے پریس منسٹر شاہ زاں، اکھلیش متل، ہما ظفر زیدی اور نیتو سنگھ نے بھی اظہار خیال کیا۔ پروگرام کے دوران پروجیکٹر کے ذریعے احمد فراز کی کلام پڑھتے ہوئے ویڈیو بھی دکھائی گئی۔

پروگرام میں موجود اہم شخصیات میں نئی دہلی میں پاکستان کے ہائی کمشنر شاہد ملک، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیرالحسن، معروف صحافی سعید نقوی، پروفیسر اختر مہدی، پروفیسر چمن لال، سریش بنوتیا، پروفیسر مدن گوپال، منیر خاتون بیگم، ودیا راؤ، جاوید نقوی، عظمیٰ صدیقی اور ڈاکٹر اخلاق احمد وغیرہ شامل تھے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مشاعروں سے اردو شاعری کے معیار کا تعین درست نہیں

● بھوپال۔ بھارت بھون کی ''کلام شاعر بہ زبان شاعر سیریز'' میں اپنا کلام پیش کرتے ہوئے مشہور شاعر شہریار نے کہا کہ مشاعروں کی شاعری کے معیار کو دیکھ کر اردو شاعری کے معیار کا تعین کرنا درست نہیں۔ آپ نے کہا کہ مشاعروں میں اداکاری، چیخ چیخ کر کلام پڑھ کر سامعین کو متوجہ کرنا اور پھر اللہ کے نام پر کچھ دے دے کے انداز میں داد کی بھیک مانگنے کے مناظر عام ہیں۔ ان حرکتوں سے اردو شاعری کو کچھ ملنے والا نہیں ہے۔ آپ نے غزل کی ہمہ گیری اور اس کی مستقبل میں بھی مقبولیت کی نوید سنائی اور کہا کہ نظم اور غزل کا آپس میں موازنہ کرنا درست نہیں۔

شہریار کی بامعنی غزلوں کے ساتھ ان کی نظموں ''تم پاس رہو'' اور ''خوابوں کا در بند نہیں'' پر باذوق سامعین نے خوب داد دی۔ شہریار نے اس موقع پر اپنے ادبی سفر کے بارے میں بھی گفتگو کی اور ہمارا ملک اور سماج جن مسائل سے دوچار ہے ان پر بھی اپنی رائے کا اظہار کیا اور کہا کہ تنگ نظری اور تعصب کسی شکل میں بھی ہو، اس سے کسی کا بھلا نہیں ہونے والا ہے۔ اس موقع پر سامعین کو بھی دعوت دی گئی کہ وہ شاعر کے روبرو ہوں۔ مختلف لوگوں نے ان کی شاعری کی ستائش کی۔ اس موقع پر شہریار نے خود بطور خاص پروفیسر آفاق احمد کو دعوت دی کہ وہ بھی کچھ کہیں۔ پروفیسر آفاق نے کہا کہ آج شہریار کی شاعری ایک ایسا اسم اعظم ہے جو اپنے سماجی شعور اور فکری بالیدگی کے ذریعے ایک مخصوص لہجے میں جو شہریار سے ہی عبارت ہے، ہمیں شعر و سخن کی اس دنیا کی سیر کراتا ہے جس کے روبرو ہو کر ہم اس کے تہہ در تہہ معنوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ آپ نے کہا آج شہریار کا کلام جن خوش قسمت سامعین کے سننے میں آیا وہ اس پر بجا طور سے ناز کر سکتے ہیں۔

اس تقریب میں محکمہ ثقافت کے سکریٹری منوج شریواستو بھی موجود تھے جبکہ بھارت بھون کے شری سونی نے شاعر کے تعارف اور نظامت کا فرض انجام دیا۔

(ندیم، بھوپال)

اردو یونیورسٹی عالمی معیار اپنائے

● نئی دہلی۔ 20 اگست، (صحافت بیورو) ابوالکلام آزاد یونیورسٹی نے اپنی تاسیس کے بعد سے گذشتہ گیارہ سالوں میں جس تیزی سے ترقی کی اس کی مثال نہیں ملتی۔ یونیورسٹی نے اس قلیل مدت میں اپنی حیثیت وافادیت منوالی ہے جس میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے البتہ سائنس کے تعلق سے یونیورسٹی کا جو ماحول ہونا چاہیے تھا اور جس سطح پر سائنس کے مضمون میں کام ہونے چاہیے تھے وہ ناپید ہیں۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں اس حقیقت سے سبھی واقف ہیں کہ جس کے پاس سائنس ہے اس کے پاس طاقت، دولت اور عزت ہے لہٰذا اس سمت میں کام کیے جانے کی سخت ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے کانفرنس ہال میں اردو یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد یک روزہ سیمینار موضوع نہرو کی خارجہ پالیسی کے دوران کیا۔ واضح رہے کہ پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کے فاؤنڈر چانسلر ہیں، جنھوں نے یونیورسٹی کو قدموں پر کھڑا کرنے کے ساتھ اسے چلنا بھی سکھایا۔ پروفیسر موصوف نے مزید کہا کہ اس سلسلے میں جہاں ماہرین سے مشوروں کے ساتھ قدم بقدم آگے بڑھنے کی ضرورت ہے وہیں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ سائنس کے اندر یونیورسٹی کا معیار عالمی پیمانے کا ہو، مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کے موجودہ چانسلر پروفیسر کے آر اقبال نے اپنی صدارتی تقریر میں نہرو کی خارجہ پالیسی کو ملک کی حالت کے لحاظ سے مناسب قرار دیا۔ انھوں نے یقین دہانی کرائی کہ وہ پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری کے مشورے کو جلدی عملی جامہ پہنائیں گے۔ اس سے قبل یو جی سی کے سکریٹری ڈاکٹر آر کے چوہان نے اپنے مقالے میں نہرو کی شخصیت کو مشرق و مغرب کے کلچر کا مجموعہ قرار دیا۔ انھوں نے نہرو کی خارجہ پالیسی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ درحقیقت نہرو کی داخلہ پالیسی ہی خارجہ پالیسی تھی ان کی معاشی پالیسی اس وقت کے سرمایہ دارانہ اور سوشلسٹ نظریے کی پیروکار نہ ہو کر ایک ملی جلی پالیسی تھی جس میں تحفظ و اعتماد کو مرکزیت حاصل تھی گرچہ وہ پڑوسی ممالک کے ساتھ تنازعات کو حل نہ کر سکے لیکن ان کی پالیسی امن اور قوم کے مفاد میں تھی یہی وجہ ہے کہ انھوں نے امن معاہدے کیے اور چین کے خلاف امریکی تعاون لینے سے انکار کر دیا کیونکہ امریکہ نے 1954 میں پاکستان کی مدد و حمایت کی تھی۔ پروفیسر محمد میاں نے نہرو کی پالیسیوں کو اس وقت کے حالات اور سیاسی منظرنامے میں دیکھنے کی وکالت کی۔ پروگرام میں شرکت کرنے والوں میں ڈاکٹر خواجہ محمد شاہد، دیپک بھت، این اے خاں، پروفیسر نصیر احمد، پروفیسر الطاف اعظمی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں جبکہ نظامت کی ذمے داری مولانا آزاد یونیورسٹی کے ڈائرکٹر شاہد پرویز نے انجام دی۔

(صحافت، دہلی)

جاپان میں اردو سو برس سے پڑھائی جا رہی ہے

● 24 اگست 2009 شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں ڈاکٹر ارتضیٰ کریم (صدر، شعبۂ اردو) کی صدارت میں جاپانی اسکالر سویامانے کی آمد پر ایک نشست کا اہتمام کیا گیا۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ غیر اردو داں طلبہ و طالبات کے لیے شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی اپنے آغاز سے ہی سرٹیفکیٹ، ڈپلوما اور اڈوانس ڈپلوما کورس کے ذریعے اردو کی

ترویج و اشاعت کا فریضہ بخوبی انجام دے رہا ہے۔ جناب سویامانے اوسا کا یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے سربراہ ہیں اور اردو کی تعلیم وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں ان کی کئی کتابیں مثلاً غلام عباس: تنقیدی مطالعہ، خطوط غالب کی تاریخی اہمیت وغیرہ منظر عام پر آچکی ہیں۔ انھوں نے اردو کے کئی شعرا اور افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا جاپانی میں ترجمہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جاپان میں اردو زبان و ادب کی تعلیم و تدریس کا آغاز ہوئے تقریباً سو سال ہو چکے ہیں۔ پچھلے سال جاپان میں ''اردو کے سو سال'' کی تقریب منائی جا چکی ہے۔ انھوں نے کہا کہ صرف غالب، میر اور پریم چند پر بات کرنے سے اردو میں لوگوں کی دلچسپی نہیں ہوگی۔ ہاں اگر ہم اردو ادب کے سرمایے کو تاریخ سے جوڑ سکیں تو عام لوگوں کی دلچسپی اس سے ہوجائے گی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو اور ہندی میں کوئی بنیادی تفریق نہیں ملتی۔ گل کرائسٹ نے بھی اسی بنیادی پر اپنی بات کہی ہے آخر میں ڈاکٹر ابوبکر عباد نے مہمانوں اور تمام حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے بجٹ میں اضافے کا اعلان

● بھوپال۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے بجٹ میں اضافہ کرنے کا اعلان کرتے ہوئے ڈاکٹر رام کرشن کسمر یا وزیر اقلیتی بہبود نے اردو اکادمی کی تقریب اعزازات میں کہا کہ اردو اور ہندی دو سگی بہنیں ہیں ان میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جائے گی اور دونوں زبانوں کی ترقی کے لیے مساعی کی جائیں گی انھوں نے کہا کہ گزشتہ 6 سال سے شاعروں اور ادیبوں کو اعزازات دینے کا سلسلہ موقوف تھا۔ ہماری حکومت کوشش کرے گی کہ اعزازات کا سلسلہ برابر جاری رہے ڈاکٹر رام کرشن کسمریا نے اعزازات پانے والے فنکاروں کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ ان کے فن سے بہتر سماج اور بہتر انسان بنانے کے عمل میں مدد ملے گی۔ انھوں نے کہا کہ 1857 کی بغاوت، جس پر اکادمی کی کتاب کی رونمائی کی گئی ہے، ہندو مسلمان اور دیگر اقوام کی متحدہ جدوجہد تھی جو آزادی کے لیے کی گئی تھی۔

اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر بشیر بدر نے اپنی صدارتی تقریر میں اردو اور ہندی کے نزدیکی رشتوں اور ان کے سنسکرت الاصل ہونے کا ذکر کرتے ہوئے اعزاز یافتگان کو مبارکباد دی۔ وائس چیئرمین مرزا جعفر بیگ نے اپنی تقریر میں کہا کہ وہ اردو اکادمی کے بجٹ میں اضافے کے لیے کوشاں ہیں جلد ہی اس کے بہتر نتائج سامنے آئیں گے۔ اس موقع پر جن شاعروں اور ادیبوں کو اعزاز دیا گیا ان کی نمائندگی کرتے ہوئے نعیم کوثر، ڈاکٹر محمد نعمان خاں اور رشید انجم نے مطالبہ کیا کہ اردو اکادمی کا بجٹ بڑھایا جائے تا کہ وہ اپنا حقیقی رول ادا کر سکے۔ انھوں نے اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری کا بھی مطالبہ کیا۔

تقریب اعزاز میں جناب نعیم کوثر کو حامد سعید خاں کل ہند اعزاز (تخلیقی ادب کے لیے) جناب صاحب امکانی کو جو ہر قریشی کل ہند اعزاز (طنز و مزاح کے لیے)، جناب طارق شاہین کو شاداں اندوری کل ہند اعزاز (تخلیقی ادب کے لیے)، جناب نجیب رامش کو سراج میر خاں سحر صوبائی اعزاز (تحقیق و تنقید کے لیے)، جناب محمد نعمان خاں کو نواب صدیق حسن خاں صوبائی اعزاز (تحقیق و تنقید کے لیے)، جناب رشید انجم کو سہا مجددی صوبائی اعزاز (تخلیقی ادب کے لیے) اور جناب گووند آریہ نشاط کو شمبھو دیال سخن صوبائی اعزاز (غیر اردو داں کے لیے) دیا گیا۔ اس میں شال مومنٹو، توصیف نامہ اور نقد رقم شامل ہے۔ نظامت کے فرائض اقبال مسعود نے انجام دیے اور شکریہ سکریٹری اردو اکادمی نصرت مہدی نے ادا کیا۔ (ڈاک سے)

اردو کے ذکر کے بغیر تاریخ آزادی ہند نامکمل

● حیدرآباد۔ 9 اگست، اردو کے ذکر کے بغیر تاریخ آزادی نامکمل رہے گی۔ آزادی کی لڑائی اردو میں لڑی گئی ہزاروں مسلم جانبازوں اور علمائے کرام نے ملک کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا لیکن آزادی کے بعد اردو کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا گیا۔ اردو آزادی سے پہلے سارے ہندوستان کی عوامی زبان تھی مولانا ضیا عرفان حسامی صدر ادارہ ''اپنا شہر اپنے لوگ'' نے ان خیالات کا مسدوسی ہال مغل پورہ میں بزم جوہر کے ماہانہ مذاکرے سے ''آزادی ہند میں اردو کا رول'' کے زیر عنوان اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ جناب محمد علی حسینی سکریٹری انجمن ترقی اردو ڈاکٹر محمد ناظم علی، جناب صادق نوید، جناب حمید الظفر مہمانان خصوصی اور مقررین میں شامل تھے ڈاکٹر راہی نے اپنے کلیدی نوٹ سے مذاکرے کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں قومی یکجہتی اور حب الوطنی کی بنیاد اردو نے رکھی۔ انقلاب زندہ باد ہندوستان پائندہ باد آزادی ہمارا حق ہے جیسے ولولہ انگیز نعرے اردو نے دیے ہیں جنگ آزادی میں اردو زبان اور اردو صحافت کا اہم کلیدی رول رہا ہے۔ آزادی کے بعد سے مجاہدینِ آزادی کو فراموش کرنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے نئی نسل حقیقی تاریخ آزادی سے نابلد ہے۔ بعد ازاں طرحی مشاعرہ زیر صدارت جلال عارف منعقد ہوا۔ جس میں انور سلیم، صادق نوید، ڈاکٹر راہی، ڈاکٹر سلیم عابدی، کامل حیدرآبادی، شوکت علی درد، محمد الطاف شاہد، میر سرور علی سرور، اثر چشتی، نادر المسدوسی، یوسف روش، روبینہ شبنم بختیار، ممتاز لکھنوی، انجم شافعی، ضیاء عرفان حسامی نے اپنے طرحی کلام سے داد تحسین حاصل کی۔ ڈاکٹر راہی نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔ (رہنمائے دکن، حیدرآباد)

زبانوں کے درمیان تال میل ضروری

● بنگلور۔ 11 اگست، مختلف زبانوں کے درمیان باہمی تال میل کو بڑھاوا دینے کی بجائے کچھ مفاد پرست سیاستداں سیاسی اغراض کے حصول اور سیاسی میدان میں قدم جمانے کے لیے ایک زبان کو دوسری زبان کے خلاف لڑانے کی جو کوششیں کررہے ہیں، اس سے ہمارا ملک کمزور ہوجائے گا۔ ان خیالات کا اظہار آج یہاں بانی الامین تحریک ڈاکٹر ممتاز احمد نے الامین کالج کے نیو سیمینار ہال میں ''ہندی ادب میں مسلم ادیبوں کا حصہ'' کے عنوان پر منعقدہ سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ کوئی بھی مذہب کسی مخصوص زبان سے لگاؤ اور دوسری زبان سے نفرت کا درس ہرگز نہیں دیتا۔ ایک دوسرے کی زبانوں کو اپنا کر ہی ایک دوسرے سے بہتر تعلقات قائم کیے جاسکتے ہیں۔ زبانوں سے واقفیت سے حکومتیں چلانا بھی آسان ہوا ہے۔ اس لیے زبانوں کے مابین جو جھگڑا ہے اسے ختم کیا جانا چاہیے۔ ڈاکٹر ممتاز نے کہا کہ ایک ریاست میں دوسری ریاست کی زبان کو ختم کرنے کی بجائے ہر ریاست میں ہر زبان کے فروغ کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر زبان کا اس کی تاریخ اور اس کے علاقے کی ثقافت میں ایک رول رہتا ہے۔ اسی طرح ہماری قومی زبان ہندی کا بھی ایک اہم رول یہ ہے کہ وہ اپنی بول چال کی بنیاد پر پورے ملک کے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر لاتی ہے۔ انھوں نے زبان کے نام پر پھیلائی جارہی نفرت کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ زبانوں کے درمیان تال میل اور اتحاد ہی ملک کی طاقت ہے۔ لیکن جس طرح مفاد پرستوں نے زبانوں کو الگ کر رکھا ہے اس سے ملک کمزور ہوتا ہے۔ انھوں نے زبانوں کو علاقائیت سے جوڑے جانے کی مخالفت کی اور کہا کہ ہندی ہندوستان کی قومی زبان ہے۔ اس لیے اس ملک کے ہر شہری کو ہندی سے واقفیت لازمی ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے کہا کہ سابق وزیر اعلیٰ رام کرشنا ہیگڈے کے دور میں اردو اور ہندی زبانوں کے مشترکہ میلوں کا اہتمام کیا جاتا تھا لیکن آج لسانی تعصب کے سبب وہ ختم ہوچکے ہیں۔ اس سلسلے کو دوبارہ شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر شیلیش زیدی، پروفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کہا کہ ہندی زبان کی پرورش میں مسلم شعرا اور ادبا کا رول انتہائی اہم رہا ہے۔ انھوں نے کسی بھی زبان کو علاقائیت سے جوڑے جانے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ زبان کے نام پر تفرقہ نہیں ڈالنا چاہیے۔ اس موقع پر ڈاکٹر مشتاق احمد پرنسپل الامین ڈگری کالج نے خیر مقدمی تقریر کی۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر شاکرہ خانم صدر شعبۂ ہندی، الامین ڈگری کالج نے کی۔ جبکہ ڈاکٹر رحمت عطا وائس پرنسپل نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ **(سیاست، بنگلور)**

اردو تعلیمی نصاب پر نظر ثانی کی ضرورت

● پٹنہ۔ 17 اگست، عوامی اردو نفاذ کمیٹی، بہار کے چیف کنوینر اور سینئر صحافی اشرف استھانوی نے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے موجودہ نصاب کو اردو کے لیے خطرناک قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ ماہرین تعلیم نے وقت رہتے اگر اس جانب توجہ نہیں دی تو دس برسوں کے بعد ریاست کے اسکولوں اور کالجوں میں اردو پڑھنے والا کوئی طالب علم ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ انھوں نے کہا کہ نہ صرف ریاست بہار میں بلکہ پورے بھارت میں اگر اردو اپنی کلاسیکی حیثیت کے ساتھ زندہ ہے تو اس کا سہرا ان مدرسوں اور مکتبوں کے سر ہے جن کا وجود ملک کی رنگارنگ تہذیب کے مخالفوں اور ''ایک ملک ایک سول کوڈ'' کے نظریے کے علمبرداروں کی آنکھوں میں کھٹکتا رہا ہے۔ اشرف استھانوی نے ریاست کے اسکولی نظام تعلیم میں پرائمری سطح سے اعلیٰ سطح تک اردو زبان و ادب سے طلبہ کی کم ہورہی دلچسپی کے لیے موجودہ تعلیمی نصاب کو ذمے دار قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس صورت حال میں اپنی ذمے داری محسوس کرتے ہوئے ماہرین تعلیم کو آگے آنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایک طرف میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں اردو کی حیثیت عملاً غیر لازمی اور معاون زبان فارسی و عربی کی حیثیت خارجی قرار دینے اور دوسری طرف فاضل کی ڈگری کی مسلمہ حیثیت کو ختم کردینے کے پیچھے چھپے طویل مدتی منصوبے کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اشرف استھانوی نے کہا کہ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ ایک لمبے سفر کے تیوروں کے ساتھ بہار میں شروع ہوئی اردو تحریک کا کارواں 81-1980 میں ریاست کے محض پندرہ ضلعوں کے لیے جزوی طور پر اردو دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل جانے اور ان اضلاع کے صرف 20 فی صد سرکاری دفاتر میں آٹھ نو سو اردو داں بے روزگار لوگوں کے لیے ملازمت کی صورت نکل جانے کو ہی اپنی منزل مقصود سمجھ کر ٹھہر گیا۔ جبکہ دوسری جانب ریاست کے گاؤں گاؤں شہر شہر کی دیواروں پر اس وقت کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا کے خلاف اہانت آمیز عبارتیں لکھنے والے مزید متحرک ہوتے چلے گئے۔ **(ہمارا سماج، دہلی)**

یوپی کے نو ودیہ ودیالیوں میں اردو بحال

● لکھنؤ۔ 7 اگست، مرکزی حکومت کے وزیر برائے فروغ انسانی وسائل نے اتر پردیش کے تمام نو ودیہ ودیالیہ سے اردو ہٹائے جانے کے فیصلہ کو منسوخ کردیا ہے ساتھ ہی نو ودیہ ودیالیہ میں سہ لسانی فارمولہ کے تحت پڑھائی جانے والی اردو کو ہٹانے کے گذشتہ فیصلہ پر نو ودیہ ودیالیہ کمیٹی سے جواب بھی طلب کیا گیا ہے۔ گذشتہ دنوں نو ودیہ ودیالیہ کمیٹی کے ایک نادر شاہی فرمان کے ذریعے اردو کی جگہ پر تیلگو، اڑیا، تامل اور پنجابی کردیے جانے کے فیصلہ سے

ریاست میں محبان اردو میں کہرام مچ گیا تھا جس کے خلاف نہ صرف اتر پردیش ہندی اور لٹریری سوسائٹی نے فوری طور پر انسانی فروغ وسائل کے وزیر کپل سبل اور نوودیہ ودیالیہ کے چیئرمین اتل کمار کو فیکس بھیج کر فیصلہ کو منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا بلکہ اس کے خلاف ایک وفد بھی دہلی کے لیے جانے والا تھا۔ گذشتہ 18 جولائی کو کپل سبل کو فیکس ملتے ہی انھوں نے نہ صرف پورے معاملے پر سخت برہمی کا اظہار کیا بلکہ نوودیہ ودیالیہ دہلی ہیڈ کوارٹر کے کمشنر سے اس بات کا جواب طلب کرلیا کہ کس کی اجازت سے اردو کو ہٹانے کا فیصلہ لیا گیا۔ ذرائع کے مطابق مرکزی وزیر کی ناراضگی کو دیکھتے ہوئے فوری طور پر نوودیہ ودیالیہ کمیٹی نے اردو ہٹانے کے اپنے سابقہ فیصلے کو منسوخ کرنے کا حکم جاری کردیا۔ مذکورہ حکم نامہ مسٹر ایم ایس کھنہ ڈپٹی کمشنر اکیڈمک نوودیہ ودیالیہ کے ذریعے جاری کیا گیا۔ نوودیہ ودیالیہ میں اردو بحالی کے حکم کا ایک خط 6 اگست 2009 کو سدھا شرما ریجنل افسر نوودیہ ودیالیہ لکھنؤ کو بھی روانہ کردیا گیا ہے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

رومی پر فلم

● جے پور۔ مشہور صوفی شاعر مولانا جلال الدین رومی کی زندگی پر ہندوستان اور ترکی کے اشتراک سے ایک فلم بنائی جائے گی۔ یہ فلم مشہور فلم ساز مظفر علی اور ایک ترکی فلم ساز کی ہدایت میں تیار ہوگی۔ فلم کی شوٹنگ کے لیے آمیر کے قلعے کی لوکیشن دیکھنے آئے مظفر علی نے یو این آئی کو بتایا کہ ترکی کے تعاون سے بننے والی اس فلم میں وہ شریک فلم ساز کے طور پر کام کریں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ فلم کی شوٹنگ اگلے سال جنوری میں شروع ہوگی اور اسے ہندوستان اور ترکی دونوں ملکوں میں فلمایا جائے گا۔ یہ فلم انگریزی میں بنے گی اور اسے بعد میں ہندی میں ڈب کرنے کا خیال ہے۔ اس میں زیادہ تر غیر ملکی فن کار کام کریں گے۔ فلم کی اب تک کی تیاریوں کے بارے میں مظفر علی نے بتایا کہ وہ اس فلم کی اسکرپٹ کو 23 بار لکھ کر اس میں اصلاح کر چکے ہیں۔ واضح رہے کہ فارسی کے اس معروف شاعر کو ہندوستان میں پردۂ سیمیں پر اتارنے کی یہ پہلی کوشش کی جارہی ہے۔ فلم میں شاعری کی عظمت اور تہذیب و ثقافت کی پوری پوری عکاسی کی جائے گی۔ فلم کو حقیقی شکل دینے کے لیے آمیر کے قلعے کا انتخاب کیا گیا ہے۔

(فاروقی تنظیم، پٹنہ)

12واں ریسرچ اسکالرز غالب سیمینار

● نئی دہلی۔ 8 اگست، تلفظ کی صحیح ادائیگی سے ہی زبان کی اصل روح کو محفوظ رکھا جاسکتا ہے حالانکہ کچھ لوگ علاقائی اثرات کا حوالہ پیش کرکے تلفظ کی صحیح ادائیگی سے انحراف کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاہم اردو زبان میں ایسے الفاظ نا کے برابر ہیں جن پر علاقائی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس لیے ہمیں اپنی کوتاہیوں اور لاپروائیوں کا اعتراف کرنا چاہیے جہاں تک ممکن ہو صحیح تلفظ کی ادائیگی پر توجہ دیں۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ اکثر یہ کہہ دیتے ہیں کہ زبان کا روزگار سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن آج ہم جس دور میں رہ رہے ہیں زبان کو روزگار سے جوڑنا ہی پڑے گا ورنہ اس کے پڑھنے والے ختم ہوجائیں گے: ان خیالات کا اظہار فارسی کے اسکالر پروفیسر اختر مہدی نے کیا۔ وہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام منعقدہ ریسرچ اسکالرز غالب سیمینار، میں تیسرے اجلاس کی صدارتی تقریر کررہے تھے۔ قبل ازیں سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں مہمان خصوصی شعیب اقبال نے کہا کہ دہلی میں اردو کے کئی ادارے ہیں لیکن زبان کے فروغ کے لیے جس پیمانے پر کام کرنے کی ضرورت ہے وہ نہیں ہو پارہا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے چیئرمین امیر حسن عابدی، جنرل سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور ڈائرکٹر شاہد ماہلی نے سیمینار کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہمیں خوشی ہے کہ ہم گذشتہ 12 برسوں سے ریسرچ اسکالرز سیمینار کا انعقاد کرتے ہوئے طلبہ کو ادبی مقالہ پیش کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ آج کئی ایسے ریسرچ اسکالرز ہیں جو بحیثیت نقاد اپنی پہچان بنا چکے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم یہاں پڑھے گئے مقالات کو شائع بھی کرتے ہیں۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر صادق نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر شریف حسین قاسمی اور ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کی اور بطور مہمان خصوصی ناشر نقوی نے شرکت کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر رضا حیدر نے انجام دیے ریسرچ اسکالر محمد شفیق تھنڈ نے اردو ادب کی تحریکات اور پنجاب، کمال اختر نے یگانہ چنگیزی کی ادبی خدمات، عبدالندیم نے علی سردار جعفری کی شاعری کا سماجیاتی مطالعہ، محمد ریاض نے اردو تحقیق اور رشید حسن خاں اور مظفر الحسن نے اردو ناول کے منفی کردار کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر شمس الحق عثمانی اور پروفیسر اختر مہدی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ممتاز عالم نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں سرفراز انور نے بین التونیت، محمد منظر علی نے اردو تبصرہ نگاری کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ، عبدالحی نے اردو میں رپورتاژ نگاری، نوری فاطمہ نے ڈاکٹر بشیش کے ایک افسانہ اے بی سی کا مطالعہ، ارشد اقبال نے مختصر افسانہ میں ثقافتی اور سماجی عناصر اور مہر النساء نے علی باقر کی افسانہ نگاری کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر عراق رضا زیدی اور راے رحمان نے کی جبکہ نظامت کے فرائض افتخار الزماں نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں عمران احمد، نگار یاسمین، عبداللہ امتیاز احمد، ابوالیمن، محمد رضوان الحق اور محمد خالد نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ مذکورہ بالا تمام صدور حضرات نے تلفظ کی صحیح ادائیگی پر زور دیا اور اردو کو باقی

رکھنے کے لیے نئی نسل کو زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنے کی وکالت کی۔

(ہمارا سماج، نئی دہلی)

اردو لرننگ کورس کا افتتاح

● بھاگل پور۔ 10اگست، گذشتہ روز بھاگلپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں سید شاہ منظر حسین کی زیر صدارت بہار اردو اکادمی کے تعاون سے 15روزہ اردو لرننگ کورس کی افتتاحی تقریب منعقد ہوئی۔ کورس کا افتتاح مہمان خصوصی ڈاکٹر سید محمد احتشام الدین، پرووائس چانسلر بھاگل پور یونیورسٹی نے کیا۔ اس پروگرام میں ڈاکٹر بھر گونندن پرساد سنگھ، ڈی ایس ڈبلیو اور ڈاکٹر رتنا مکھرجی، پراکٹر مہمان اعزازی کی حیثیت سے موجود تھے۔ شعبے کے صدر ڈاکٹر محمد بدرالدین شبنم نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ تقریب کا آغاز شعبے کے طالب علم مکرم شاہین کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ فردوس عسکری نے مترنم آواز میں نعت پیش کی۔ اس کے بعد شبینہ ہاشم اور رخسار ہاشم دونوں سگی بہنوں نے ترانہ ہندی پیش کیا۔

اس موقع پر مہمان خصوصی ڈاکٹر سید احتشام الدین نے کہا کہ اردو انتہائی دلنشیں اور ہر دلعزیز زبان ہے۔ اسے سیکھ کر چہرے پر ایک طرح کی طمانیت ابھر آتی ہے۔ انھوں نے لتا منگیشکر کے اردو سیکھنے کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ تلفظ کی ادائیگی کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر بدرالدین شبنم نے کہا کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جو صدیوں سے دلوں پر حکومت کرتی چلی آرہی ہے۔ اردو اور ہندی دونوں زبانیں جڑواں بہنیں ہیں جو جدید ہند آریائی قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو لرننگ کورس اردو دانوں اور غیر اردو دانوں کو قریب کرنے کا بہترین وسیلہ ہے۔ آخر میں ڈاکٹر ابوعبیدہ ابدالی نے ہدیۂ تشکر پیش کیا۔ اس پروگرام میں ڈاکٹر شرمیلا باگچی صدر شعبۂ بنگلہ، ڈاکٹر وجے کمار رائے، ڈاکٹر فاروق علی، ڈاکٹر رضی احمد شاداب، قمر علی قمر، ڈاکٹر شرینی، شبیر احمد جعفری، محسن علی انجم، مولانا رفیق احمد خاکی، ڈاکٹر محمد کلیم الدین، ضیاء الاسلام رضوی، کہکشاں تبسم، ڈاکٹر محمد صدیق اور ڈاکٹر خالدہ ناز کے علاوہ سینکڑوں خواتین و حضرات موجود تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مادری زبان میں تعلیم کا حصول ناگزیر

● حیدرآباد۔25اگست، اردو اکادمی جدہ کی جانب سے گورنمنٹ پرائمری اسکول جنگم میٹ فلک نما میں اسکول کے طلبہ وطالبات میں اسکول یونیفارمس تقسیم کیے گئے۔ غلام آصف صمدانی سرپرست اعلیٰ اکادمی نے بچوں میں یونیفارمس تقسیم کرنے کے بعد مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ کیونکہ اسباق اور مضامین کو بچے اپنی ہی مادری زبان میں بہتر سمجھ سکتے ہیں اور اس کے ذریعے ہی تعلیم حاصل کرنے کے مقاصد کی تکمیل ہوسکتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ساتھ ہی انگریزی زبان جو بین الاقوامی سطح پر رابطے کی زبان ہے کو سیکھیں اور علاقائی زبان سے بھی واقفیت حاصل کریں۔ ہم جتنی زبانیں سیکھیں گے اتنا ہی سوسائٹی میں آگے بڑھ سکیں گے۔ سید جمال اللہ قادری صدر اکادمی نے تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ کوئی قوم بغیر تحصیل علم کے ترقی نہیں کرسکتی۔ ہر مذہب خصوصاً مذہب اسلام میں تحصیل علم پر زور دیا گیا ہے۔ علم ایک ایسی دولت ہے جس کو ہم جتنا زیادہ صرف کریں گے اس میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔ انھوں نے بچوں کو تلقین کی کہ وہ سچی لگن اور محنت سے تعلیم حاصل کریں اور سماج میں ایک بہتر مقام حاصل کریں۔ سلیم فاروقی معتمد عمومی اکادمی نے کہا کہ یونیفارم ایک پہچان ہے اور اس کے ذریعے اپنے مدرسے کی بھی پہچان ہوتی ہے۔ ہر طالب علم کو چاہیے کہ وہ اپنا، اپنے ماں باپ، استاد اور اسکول کا نام روشن کرے۔ جس کے لیے ضروری ہے کہ وہ تعلیم کے حصول میں محنت اور لگن کو اختیار کرے۔ صبیحہ سلطانہ ہیڈ مسٹریس نے اردو اکادمی جدہ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس اکادمی کی سرگرمیاں ناقابلِ فراموش اور دوسروں کے لیے قابلِ تقلید ہیں۔ عبدالباری (اردو پنڈت) نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ خواجہ افتخار حسن سابق صدر مدرس اور دوسرے اساتذہ اس موقع پر موجود تھے۔ (منصف، حیدرآباد)

''آثار الصنادید'' پر لیکچر

● نئی دہلی۔ 8اگست، انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر اور علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن دہلی کے زیر اہتمام آج ''سرسید کی آثار الصنادید۔1846 سے 2006 تک ایک تاریخی تجزیہ'' کے عنوان سے پروگرام منعقد کیا گیا، جس کی صدارت اے ایم یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے صدر صفدر ایچ خان نے کی۔ نظامت کے فرائض فصیح اللہ خان اور وصی احمد نعمانی نے انجام دیے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تاریخ کے استاد پروفیسر عزیز الدین حسین نے اس موضوع پر مفصل مقالہ پیش کیا اور بعد میں سلائڈ شو کے ذریعے آثار الصنادید میں مذکور تاریخی عمارتوں کی ماضی اور حال کی صورت کو بڑے دلکش انداز میں پیش کیا۔ پروفیسر عزیز الدین حسین نے بتایا کہ سرسید نے 1846 میں آثار الصنادید تصنیف کی تھی اور دہلی کی تاریخی عمارتوں پر یہ سب سے پہلی اور سب سے مستند اردو دستاویز ہے۔ انھوں نے بتایا کہ انگریزوں نے اپنی موجودگی اور اقتدار کے مظاہرے کے لیے بہت سی تاریخی عمارتوں کو منہدم کردیا تھا۔ لال قلعے کی موجودہ ہیئت اصل لال قلعے کا محض 20 فیصد ہے جبکہ 80 فیصد حصہ انگریز حکمرانوں نے منہدم کردیا تھا۔

انھوں نے بتایا کہ انگریزوں نے بہت سی تاریخی مسجدوں کو بھی شہید کیا تھا اور لال قلعہ اور پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن کے درمیان جو ریلوے لائن بچھی ہوئی ہے وہ مسجد زیب النسا اور ایک مقبرے کو منہدم کر کے نکالی گئی تھی کہ جامع مسجد شاہ جہانی کے سامنے ایک مسجد اکبرآبادی بیگم تھی جس کو انگریزوں نے منہدم کر دیا تھا۔ پروفیسر عزیز الدین حسین نے بتایا کہ شاہ جہان آباد کے دہلی دروازے اور لاہوری دروازے کے درمیان کی چہار دیواری کو بھی انگریز حاکم منہدم کرنا چاہتے تھے لیکن افرادی قوت نہ ہونے کے سبب وہ ایسا نہیں کر سکے تھے۔ انھوں نے اپنے سلائڈ شو کے ذریعے دہلی کی بہت سی معدوم اور کچھ تاریخی باقیات کا بہت ہی پر اثر تجزیہ پیش کیا۔

اس موقع پر صفدر ایچ خان نے کہا کہ اس طرح کے پروگراموں سے ہندوستانی عوام اور خاص طور پر مسلمانوں کو اپنے شاندار ماضی سے روبرو ہونے کا موقع ملتا ہے اور یہ ہم سب کا فرض ہے کہ ہم اپنی شاندار روایات اور ماضی کے حالات کو گاہے گاہے اسی انداز سے تازہ کرتے رہیں۔ آئی آئی سی سی کے سکریٹری وصی احمد نعمانی نے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی اس کوشش کی تعریف کی اور کہا کہ پروفیسر عزیز الدین حسین نے مختصر سے وقت میں سرسید کی تصنیف کا جو خوبصورت خلاصہ پیش کیا وہ انہی کا حصہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ ان کا مقالہ ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس موقع پر یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر، اے ایم یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن اور ماہرین پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جائے جو دہلی کے آثار قدیمہ اور ان تاریخی عمارتوں کے تحفظ کی تحریک چلائے جن کا ذکر آثار الصنادید میں کیا گیا ہے۔ نیشنل مائنارٹیز فائنانشل کارپوریشن کے ایم ڈی ابرار احمد نے اس کے لیے 11 ہزار روپے کی پیش کش بھی کی۔ پروگرام میں موجود دیگر اہم شخصیات میں ابرار احمد، احمد رضا، ایم اے حق، الیاس ملک، ایس ایم خان، اویس خان، وسیم احمد، طارق امین، بہار یوبرقی، چودھری شریف الدین، ابوبکر، ملک ذہین اور عذرا سلطان کے نام شامل ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

نئی نسل ا، ب سے۔۔۔

● حیدرآباد۔ 18 اگست، اردو ادب میں بچوں کے لیے لکھی جانے والی کہانیوں کی کتابیں آج بالکل ہی ناپید ہو چکی ہیں۔ نئی نسل کے ادب کی طرف راغب نہ ہونے کی وجہ شاید یہی ہے کہ انھیں بچپن میں ہی اپنی مادری زبان میں کہانیوں کی کتابیں یا مواد حاصل نہیں ہو پا رہا ہے۔ ناول اور افسانے بھی اب کم لکھے جا رہے ہیں۔ مشہور اردو ادیب اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ عبدالصمد نے آج یہاں حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی میں منعقدہ ''مصنف سے ملاقات'' تقریب سے مخاطب کے دوران ان خیالات کا اظہار کیا۔ ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام اس تقریب کو منعقد کیا گیا تھا۔ عبدالصمد نے اپنے خطاب میں کہا کہ ان کی ادبی زندگی کا آغاز بچوں کی کہانیاں لکھنے سے ہوا ان کی پہلی کہانی ''جھوٹ کی سزا'' 1961 میں شائع ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ بعد ازاں وہ افسانوں کے ساتھ ساتھ ناولیں بھی لکھنے لگے۔ ان کی پہلی ناول 1971 کی ہند۔پاک جنگ اور بنگلہ دیش کے قیام کے دوران ہوئے مختلف واقعات بالخصوص بہار والوں کے خلاف ہوئے فسادات و دیگر مشکل حالات کا احاطہ کرتی ہے۔ اس ناول ''دو گز زمین'' کو پورے ملک میں ستائش حاصل ہوئی ہے اور انھیں ساہتیہ اکادمی نے 1990 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا ہے۔ عبدالصمد نے بتایا کہ اب تک ان کے 6 ناول شائع ہو چکے ہیں جبکہ 7 واں ناول عنقریب شائع ہوگا۔ عنبر بہرائچی کنوینر اردو بورڈ، ساہتیہ اکادمی نے اپنے خطاب میں اردو و ہندی ادب میں توسیع کی ضرورت ظاہر کی۔ انھوں نے کہا کہ شمال کے شعرا و ادبا کی جنوب میں زبردست پذیرائی ہوئی ہے جبکہ جنوبی شعرا اور ادبا کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ وہ شمالی ہند اور جنوبی ہند کی ادبی شخصیات کا باہم تبادلۂ خیال کروانا چاہتے ہیں۔ عنبر بہرائچی نے دکن بالخصوص شہر حیدرآباد کو علم و فن کا مرکز قرار دیا۔ قبل ازیں صدر شعبۂ اردو حیدرآباد یونیورسٹی پروفیسر بیگ احساس نے عبدالصمد کا تعارف کرایا جبکہ ریجنل سکریٹری ساہتیہ اکادمی بنگلور اے ایس النگول نے استقبالیہ خطاب کیا۔ بعد ازاں سوال و جواب کا سیشن بھی منعقد کیا گیا۔ اس موقع پر سلیمان اطہر جاوید، یوسف سرمست، قدیر زماں، عظیم بخش، علی ظہیر قمر جمالی و دیگر بھی موجود تھے۔

(منصف، حیدرآباد)

اطلاعاتی معاشرے میں زبان بنیادی اہمیت کی حامل ہے

● نئی دہلی۔ 7 جولائی، نئے اطلاعاتی معاشرے میں ترسیلی مہارت کا حصول بہت ضروری ہے اور زبان سے واقفیت کی اہمیت روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہے۔ اس خیال کا اظہار اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کی جانب سے منعقدہ مدھیہ پردیش کے اردو میڈیم اسکولوں کے اساتذہ کے اورینٹیشن پروگرام کے اختتامی اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی شعبۂ عوامی ترسیل کے صدر پروفیسر شافع قدوائی نے کیا۔ پروفیسر اختر الواسع نے اپنی تقریر میں کہا کہ زبانیں اپنا سفر جاری رکھتی ہیں اور کبھی منجمد نہیں ہوتیں۔ ترجیحی مہارت کا مطلب زبان کے بدلتے ہوئے مزاج سے مکمل واقفیت ہے۔ صدر جلسہ پروفیسر صغریٰ مہدی نے کہا کہ اساتذہ کے علم کی تجدید ضروری ہے اور اس طرح کے پروگرام اساتذہ کی صلاحیتوں کو بہتر بنانے میں بہت معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اکادمی کے ڈائرکٹر

پروفیسر غضنفر علی نے کہا کہ تدریس کے نئے طریقوں اور اساتذہ میں ترسیلی مہارت کے فروغ کے لیے اس سات روزہ اورینٹیشن کورس کا انعقاد کیا گیا جس میں دہلی اور بیرون دہلی کے مشہور اساتذہ اور ماہرین تعلیم نے لکچر دیے۔ اساتذہ کو نثر ونظم کی تدریس، مختلف علوم کی تدریس اور اسباق کی منصوبہ بندی سے متعلق واقف کرایا گیا ہے۔ اس پروگرام میں ریاست مدھیہ پردیش کے 143 اساتذہ نے شرکت کی۔ مدھیہ پردیش کے محکمۂ تعلیم کی جانب سے تعینات مشاہدین ڈاکٹر یاسمیں خان، ڈاکٹر عارف جنید، ڈاکٹر محمد حفیظ اور ڈاکٹر رفعت سلطانہ نے بھی شرکت کی۔

اس اختتامی اجلاس میں مدھیہ پردیش کے اردو اساتذہ محبوب خاں، محمد جمیل خاں، ڈاکٹر محمد عارف جنید ندوی، ڈاکٹر سیدہ اسرار قریشی، صدیق الرحمٰن فیضی اور ڈاکٹر رفعت سلطانہ نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ جلسے کی نظامت کو آرڈینیٹر ڈاکٹر شہزاد انجم نے کی۔ (ڈاک سے)

اپنی تہذیب اور ادبی قدروں کی حفاظت ضروری

● بھوپال۔ 18 اگست، بھوپال شہر کی ادبی اور تہذیبی تنظیم ''ادبی کہکشاں'' کے زیر اہتمام ایک شاندار مشاعرے اور اعزازیہ پروگرام کا انعقاد کیا گیا، جس میں مجاہد آزادی پنڈت بھگوان داس سارسوت کو شال وشری پھل اور اعزاز دے کر ان کی قربانیوں کو دیا کیا گیا۔ پروگرام کے مہمان خصوصی سابق وزیر عزیز قریشی تھے، جبکہ صدارت یوتھ لیڈر عارف مسعود نے کی۔ اس موقع پر دہلی سے تشریف لائے زاہد علی اثر نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

عزیز قریشی نے اس موقع پر شعرا اور ادبا کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں اپنی تہذیب اور ادبی قدروں کی ہر قیمت پر حفاظت کرنی ہے اور انھیں ٹوٹنے سے بچانا ہے۔ ملک سے غریبی، جہالت اور بے کاری کو دور کرنے کے لیے جدوجہد جاری رکھنے پر زور دیا۔ پنڈت بھگوان داس سارسوت نے آزادی کے بعد ملک کی تقسیم کو سب سے بڑی بدنصیبی بتاتے ہوئے نوجوانوں کو ملک کا سب سے بڑا سرمایہ بتایا اور کہا کہ یہ خوشی کی بات ہے کہ موجودہ وقت میں لوگوں کے دلوں سے فرقہ پرستی کا زہر ختم ہو رہا ہے۔

جشن آزادی کے اس پروگرام میں عزیز قریشی اور عارف مسعود نے عبدالوحید ایڈوکیٹ، گل نامہ، امتیاز انجم اور زاہد علی خاں اثر کو گلدستے پیش کیے۔ آخر میں مشاعرے کا آغاز ہوا جس میں امتیاز انجم، رہبر جونپوری، زاہد علی خاں اثر (دہلی)، کامل بہزادی، بیدار، ممتاز صدیقی، پروین صبا، عارف علی عارف، جلال میکش، مظفر طالب، مولانا افضل، ساجد پریمی، احد پرکاش، ڈاکٹر اطہر، خلیل قریشی، محمد حنیف درد (سرونج) سوریہ پرکاش اشٹھانا، تاج الدین تاج، رئیس الحسن آتش، رفیق بیکس، شرافت علی شرافت، احسان وارثی اطہر (ودیشہ)، احمد الدین خاں اشرف، بدرالدین درد، (سرونج) محبوب احمد محبوب، مظفر پرویز (بدھنی) وغیرہ نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ پروگرام کی نظامت ادبی کہکشاں کے سکریٹری سلیم قریشی نے کی۔ تنظیم کے صدر احد پرکاش نے کہا کہ ادبی کہکشاں گذشتہ 2 برسوں سے شہر میں ادبی تہذیبی پروگرام کو منعقد کرتی آرہی ہے اور بھوپال کے شاعروں، ادیبوں، کویوں اور صحافیوں کی ادبی اور تہذیبی خدمات کے لیے انھیں اعزاز بھی دیتی آرہی ہے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

رنگ منچ کے باپو

● شولاپور۔ اردو اسٹیج پر سوانحی ڈراموں کی مثالیں خال خال ہی ملتی ہیں، نظیر اکبرآبادی، غالب، علامہ اقبال، ٹیپو سلطان، اورنگ آباد، امراؤ جان، بیگم عزیز النساء، فیض احمد فیض، وغیرہ پر ماضی میں اردو میں ڈرامے پیش کیے گئے ہیں لیکن ایسا شاید ہی ہوا ہو کہ کسی بڑی شخصیت کے انتقال کے محض ایک ماہ بعد ہی اس پر ایک فل لینتھ دستاویزی ڈراما تیار کر دیا گیا ہو۔۔۔ یہ کام کر دکھایا اردو کے مشہور ڈراما نگار اقبال نیازی نے، جنھوں نے حبیب تنویر کے انتقال کے بعد ان کی عملی زندگی کے 60 برسوں کی روداد، تھیٹر میں ان کی جدوجہد، ان کی ڈراما نگاری، ہدایت کاری، شاعری، صحافت اور موسیقی سے ان کے لگاؤ ان تمام پہلوؤں کو لے کر 90 منٹ کا ایک ڈراما تحریر کیا'' رنگ منچ کے باپو'' جو گذشتہ دنوں شولاپور میں مہاراشٹر اردو اکادمی کے زیر اہتمام اردو ڈراما فیسٹول میں پیش کیا گیا۔ چونکہ یہ ڈراما فیسٹول حبیب تنویر کے نام سے ہی منسوب تھا اس لیے بھی اس فیسٹول میں ''رنگ منچ کے باپو'' کی پیشکش ایک بھرپور معنویت لیے ہوئی تھی ہتاتما سمرتی مندر ہال میں منعقد ہونے والے اس فیسٹول میں شہر شولاپور کے پانچ ڈرامے پیش کیے گئے۔ ایکٹ گروپ سے سیّد اقبال کی پراثر ہدایت کاری میں ''رنگ منچ کے باپو'' نے خوب رنگ جمایا اور شولاپور کے ہندی مراٹھی اخبارات نے ڈرامے کو زبردست داد وتحسین سے نوازا۔ ڈرامے کی موسیقی ساحر نداف نے ترتیب دی تھی جبکہ سیٹ ساجد فراش اور روشنی عطاء اللہ چودھری نے ڈیزائن کی۔ اس دلچسپ سوانحی ڈرامے میں ایک نہیں تین تین حبیب تنویر کے کردار تھے جو بقول ڈراما نگار اقبال نیازی، حبیب تنویر کی زندگی کے تین مختلف ادوار کی نمائندگی کرتے ہیں۔ تین حبیب تنویر کے کردار حتوم قریشی، رندھیر ابھینکر اور اشوک قلعہ دار نے بخوبی نبھائے، بیوی مونیکا تنویر اور ابتدائی دور کی حبیب تنویر کی ساتھی بیگم قدسیہ زیدی کے دوہرے کردار ساریکا اگنی ہوتری نے بیٹی نگین تنویر کا کردار شبانہ مجاور نے بہت خوبصورتی کے ساتھ ادا

کیا۔ ڈرامے کا ایک اہم کردار سوتر دھار (ترجمان) میں آویز شیخ کی متاثر کن اداکاری نے لوگوں کو اخیر تک ڈرامے سے باندھے رکھا۔ اس ڈرامے میں مرحوم اطہر پرویز، بلراج ساہنی کے کردار بھی ہیں اور نیا تھیٹر کے فوک کلاکاروں کو بھی تمثیلی طور پر پیش کیا گیا ہے۔

ڈراما ''رنگ منچ کے باپو'' کی خاص بات یہ ہے کہ اس کے گیت، نظمیں اور غزلیں حبیب تنویر کی ہی تحریر کردہ ہیں، اپنی موت سے چند روز پہلے کہی ہوئی ان کی تاثراتی نظم "The Trees" جو حبیب صاحب نے بیگم مونیکا تنویر کی یاد میں لکھی تھی وہ بھی اس ڈرامے کا جذباتی حصہ ہے۔ ''رنگ منچ کے باپو'' عید کے موقع پر ممبئی کے ساٹھے کالج آڈیٹوریم میں پیش کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں مہاراشٹر کے مختلف شہروں میں بھی اس کے شو ہوں گے۔ (ڈاک سے)

اردو کے ساتھ ناانصافی

● نئی دہلی۔ 23 اگست، دہلی شاخ ایجوکیشنل اینڈ پولیٹیکل سوسائٹی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر فہیم بیگ نے کہا کہ دہلی میں اردو زبان کے ساتھ ناانصافی کی جارہی ہے۔ دہلی کے بھی اقلیتی علاقوں یا ان کے آس پاس کے اسکولوں میں اردو نہیں پڑھائی جارہی ہے جب کہ ہندوستانی آئین کی دفعہ 1350 اے، 21 اے کے مطابق ہر ہندوستانی کو اپنی مادری زبان پڑھنے کا پورا حق ہے۔ سچر کمیٹی کی سفارش اور وزیراعظم کے 15 نکاتی پروگرام میں بھی کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کو ان کے تعلیمی و دیگر حقوق ہر قیمت پر دیے جانے چاہییے۔ باوجود اس کے دہلی ایم سی ڈی اور دہلی حکومت کے اسکولوں میں نہ تو اردو پڑھانے کا نظام ہے اور نہ ہی اس کے لیے کوشش کی جارہی ہے جب کہ دہلی سرکار نے اردو کو دوسری زبان کا درجہ دیا ہوا ہے ساتھ ہی سبھی اسکولوں کو سرکولر جاری کر کے کہا گیا ہے کہ جس اسکول میں کسی زبان کے 6 یا اس سے زیادہ طالب علم ہوں، انھیں اس زبان کا ٹیچر مہیا کرا کے تعلیم دی جائے۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

اردو سب کی زبان ہے

● حیدرآباد۔ 23 جولائی، بزم اردو اے جی آفس حیدرآباد کے زیر اہتمام کل دوپہر اے جی آفس کے اوپن ایرآڈیٹوریم میں غزل سنگیت اور مکری کا رنگارنگ پروگرام پیش کیا گیا، جس کی صدارت ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل مسٹر مرگیانے کی اور اردو زبان سے پوری طرح واقف نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اردو زبان و شاعری کی شرینی اور چاشنی سے بے حد متاثر ہوئے۔ ایس کے افضل الدین نائب صدر اردو اکادمی نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان و ادب کو کسی فرقے یا مذہب کے ساتھ منسوب کرنا ناانصافی ہے۔ یہ تمام قوموں کی مشترکہ زبان ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ زبان صرف زمین پر ہی نہیں بولی جاتی ہے بلکہ خلا میں بھی اس کا استعمال ہوا ہے جب خلانورد راکیش شرما نے خلائی جہاز سے اندرا گاندھی سے بات کی تو انھوں نے اقبال کا یہ مصرعہ پڑھا تھا۔'' سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' ایس کے افضل الدین نے سنگیتا مترا کے فن اور پروگرام سے متاثر ہو کر انھیں اردو اکادمی کی جانب سے 5 ہزار روپئے عطیہ دینے کا اعلان کیا۔ تقریب میں بزم اردو کے جنرل سکریٹری محمد عارف الدین کو ان کی وظیفہ یابی کے سلسلے میں تہنیت پیش کی گئی اور ان کی خدمات کو سراہا گیا اور کہا گیا کہ انھوں نے بزم اردو کے ذریعے اردو کلچر کے فروغ میں اہم رول ادا کیا۔ آفس کی مختلف تنظیموں کی جانب سے محمد عارف الدین کی گلپوشی بھی کی گئی۔ ایس کے افضل الدین نے کہا کہ محمد عارف الدین اپنی ذات میں انجمن ہیں سرکاری ملازمت سے وابستہ رہتے ہوئے بھی وہ ہمیشہ سماجی اور ترقیاتی سرگرمیوں سے وابستہ رہے۔ بزم کے دیگر عہدیداروں سید محمود اور عبدالقادر کی بھی گلپوشی کی گئی۔ ابتدا میں بزم کے صدر شیخ محی الدین نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور بزم کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ پروگرام کی کارروائی منیر خان نے چلائی۔ آخر میں عبدالحفیظ نے شکریہ ادا کیا۔ سنگیتا مترا نے اپنی مترنم آواز کا جادو جگاتے ہوئے ہم عصر اور کلاسیکی شعرا کا کلام پیش کیا۔ طبلے پر مشہور فنکار نجم الدین جاوید نے سنگت کی۔ محمد عارف الدین نے ان کی تعلق سے ظاہر کردہ خیالات پر اظہار تشکر کیا۔ حسین بن محمد، محمد عثمان اور شریمتی بھارتی نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ (منصف، حیدرآباد)

شعبۂ اردو کے قیام کا تیقن

● بنگلور۔ 15 جولائی، خواتین یونیورسٹی بیجاپور میں پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اردو کا قیام اور ریاست بھر میں نئے شروع کیے گئے اور موجودہ پری یونیورسٹی (جونیئر) اور ڈگری کالجوں میں اردو کی اسامیوں کو پر کرنے کا پرزور مطالبہ کیا گیا۔ خواتین یونیورسٹی بیجاپور کے سنڈیکیٹ ارکان جناب رفیع بھنڈاری اور شری ارون شاہ پور نے یہاں ریاستی وزیر برائے اعلیٰ تعلیم اروند لمباولی سے ملاقات کر کے اس خصوص میں ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں کہا گیا ہے کہ خواتین یونیورسٹی بیجاپور شمالی کرناٹک میں اردو کے کثیر آبادی والے علاقوں پر مشتمل ہے، جہاں اردو میڈیم کے سینکڑوں پرائمری اور ہائی اسکول موجود ہیں، اور بے شمار جونیئر اور ڈگری کالجوں سے ہر سال کے لیے سینکڑوں طالبات باہر آرہی ہیں۔ مگر اعلیٰ تعلیم کے مواقع بالخصوص اردو میں پوسٹ گریجویٹ کورس نہ ہونے کے سبب اردو سے اپنا رشتہ ترک کر رہے ہیں، انھوں نے بتایا کہ خواتین

یونیورسٹی بیجاپور اردو کے لیے ایک مناسب وموزوں ادارہ ہے، جہاں پر پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اردو یقیناً ترقی کرسکتا ہے۔ میمورنڈم میں ریاست کے بیشتر سرکاری جونیئر اور ڈگری کالجوں میں اردو سبجیکٹ کو نہ رکھنے کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ریاست میں پہلے سے قائم غیر سرکاری اور سرکاری جونیئر اور ڈگری کالجوں میں اردو لکچرار کے ریٹائرمنٹ کے بعد اکثر کالجوں میں اردو سبجیکٹ نکال دیا گیا ہے، یا اردو لکچرارس کی بھرتی نہیں ہوئی ہے۔ اس طرح نئے شروع کیے گئے سرکاری جونیئر اور ڈگری کالجوں میں اردو پڑھنے والوں کی ڈیمانڈ رہنے کے باوجود اردو سبجیکٹ نہیں رکھا گیا ہے۔ جناب بھنڈاری اور ارون شاہ پور نے وزیر موصوف کو آگاہ کیا کہ شمالی کرناٹک اردو کی ترقی وفروغ کے لیے ایک زرخیز زمین کی حیثیت رکھتا ہے، اگر حکومت اس علاقے میں اردو زبان کی ترقی وترویج کو اڈاپٹ کرے گی تو نہ صرف اردو بذریعۂ میڈیم یا سبجیکٹ داخلہ لینے والوں کے لیے کافی مددگار ثابت ہوگی، جس کے یہاں کی تہذیب اور ثقافت پر اچھے اثرات پڑسکتے ہیں۔ وزیر برائے اعلیٰ تعلیم اروند لمباولی نے نصف گھنٹے کی اس ملاقات میں اردو کے متعلق اپنے بہترین تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ کیوں ابھی تک خواتین یونیورسٹی بیجاپور میں پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اردو قائم نہیں کیا گیا؟ انھوں نے یقین دلایا کہ وہ اس خصوص میں فوری اقدامات کرتے ہوئے متعلقہ محکمہ کو ہدایات جاری کریں گے۔ وزیر موصوف نے جونیئر اور ڈگری کالجوں میں اردو کی خالی اسامیاں اور نئے شروع کیے گئے کالجوں میں اردو سبجیکٹ رکھنے کے متعلق بھی سنجیدگی سے غور کرنے کا تیقن دیا۔ **(سیاست، بنگلور)**

صالحہ عابد حسین پر سیمینار

● پنچکولہ، 20 اگست، ہریانہ اردو اکادمی کے زیر اہتمام معروف ادیبہ صالحہ عابد حسین کے یوم ولادت پر ایک روزہ قومی سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ افتتاحیہ اجلاس میں اکادمی کے سکریٹری کشمیری لال ذاکر نے مہمان خصوصی سیدہ سیدین حمید ممبر پلاننگ کمیشن (حکومت ہند) کو گلدستہ پیش کیا۔ رتیو چودھری، پروفیسر صغریٰ مہدی، ڈاکٹر خوشحال زیدی نے شجرکاری کی۔ اس دوران کشمیری لال ذاکر کے ناول ''یہ کھنڈر بھی میرے'' کا اجرا سیدہ سیدین نے کیا۔ یہ ناول خوشحال زیدی نے بزم خضر راہ پبلشنگ ہاؤس سے شائع کیا ہے۔

استقبالیہ تقریر میں کشمیری لال ذاکر نے خواجہ غلام السیدین سے متعلق ماضی کی ان یادوں کو تازہ کیا جن کا تعلق صالحہ عابد حسین کی زندگی سے ہے۔ کلیدی خطبہ ''صالحہ عابد حسین کی ادبی حیثیت'' کے عنوان سے پروفیسر صغریٰ مہدی نے پیش کیا۔ افتتاحیہ تقریر میں ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید نے صالحہ عابد حسین کے فکری، فنی، سماجی اور معاشرتی رجحانات، خیالات اور خدمات پر روشنی ڈالی۔

صدارتی تقریر رتیو چودھری، سٹی مجسٹریٹ پنچکولہ نے کی۔ شمس تبریزی نے سب مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ پہلے اجلاس میں ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے مقالہ بعنوان ''صالحہ عابد حسین کی یادیں اور ملاقاتیں'' پڑھا۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر خوشحال زیدی نے بعنوان ''بچوں کی صالحہ عابد حسین'' پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ صالحہ عابد حسین نے بچوں کے لیے دلچسپ کہانیاں، ڈرامے وغیرہ لکھے ہیں۔ تیسرا مقالہ ڈاکٹر شہپر رسول نے ''صالحہ عابد حسین کی خودنوشت سوانح نگاری'' (سلسلۂ روز وشب، کی روشنی میں) کے عنوان سے پیش کیا۔ چوتھا مقالہ مہندر پرتاپ چاند نے ''بیگم صالحہ عابد حسین کی شخصیت کے کچھ امتیازی پہلو'' کے عنوان سے پڑھا۔ پانچواں مقالہ محمد مستمر نے ''صالحہ عابد حسین کی افسانہ نویسی۔ ایک تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے پیش کیا۔ پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر خوشحال زیدی نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر نشاں زیدی نے انجام دیے۔

دوسرے اجلاس میں پڑھا جانے والا پہلا مقالہ ڈاکٹر نشاں زیدی کا تھا بعنوان ''صالحہ عابد حسین کے ناولوں میں نسائی حسیت''۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر محمد ایوب خاں نے ''صالحہ عابد حسین اور ان کی افسانہ نگاری'' کے عنوان سے پیش کیا۔ تیسرا اور آخری مقالہ امر ساہنی نے ''صالحہ عابد حسین کی تحریروں میں ہندوستانی عورت'' کے عنوان سے پیش کیا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر صغریٰ مہدی نے کی اور نظامت شمع افروز زیدی نے۔ بعد ازاں پروفیسر صغریٰ مہدی نے پڑھے گئے سبھی مقالات پر اختصار وجامعیت کے ساتھ اپنی مبصرانہ رائے کا اظہار کیا۔ اختتامی اجلاس میں کشمیری لال ذاکر نے اپنی سفارشات پیش کیں اور سبھی مہمانوں اور اسکالروں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

شمس الرحمٰن فاروقی عالمی ایوارڈ کے لیے نامزد

● نئی دہلی۔ اردو کے معروف نقاد، شاعر، ناول نگار اور پدم شری اعزاز یافتہ ادیب شمس الرحمٰن فاروقی کو ان کی تاحیات ادبی خدمات کے مدنظر امریکہ کی اردو مرکز انٹرنیشنل ایوارڈ کمیٹی نے سال 2009 کا ''امرلکھنوی اردو انٹرنیشنل ایوارڈ'' دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ ایوارڈ ایک شال، مومینٹو اور پانچ ہزار امریکی ڈالر پر مشتمل ہے۔ یہ ایوارڈ 8 نومبر 2009 کو لاس اینجلس (امریکہ) میں منعقد ہونے والی تقریب میں پیش کیا جائے گا۔ یہ اعلان اردو مرکز انٹرنیشنل ایوارڈ کمیٹی کیلی فورنیا (امریکہ) کی سکریٹری جنرل نیر جہاں کی جانب سے کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ فاروقی صاحب 18 ستمبر 2009 کو یونیورسٹی آف

ورجینیا (امریکہ) میں ''شمالی ہند کی عوامی بولیوں کی ادبی تاریخ'' کے موضوع پر منعقد ہونے والے سیمینار میں ایکسپرٹ کی حیثیت سے شرکت فرمائیں گے اور 10 اکتوبر 2009 کو کولمبیا یونیورسٹی نیویارک میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے اردو کے پی ایچ ڈی اسکالرس سے خطاب کریں گے۔

اردو۔ مشترکہ تہذیب کے فروغ کا اہم وسیلہ

● حیدرآباد۔ یکم اگست، اردو زبان ہندوستان کی مشترکہ تہذیب وثقافت کی علمبردار اور رواداری وسیکولر قدروں کی محافظ ہے۔ لہٰذا مشترکہ تہذیب کے فروغ کے لیے اردو کی ملک گیر ترقی و اشاعت ضروری ہے۔ ان خیالات کا اظہار مسٹر سوکمار ڈپٹی ڈائرکٹر ایجوکیشن، ملاّ پورم، کیرالا نے مرکز پیشہ ورانہ فروغ برائے اساتذۂ اردو ذریعۂ تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے زیراہتمام ملاّ پورم، کیرالا میں اردو اساتذہ کے لیے منعقدہ تربیتی پروگرام کی اختتامی تقریب میں اپنے کلیدی خطبے کے دوران شرکا سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ اس دس روزہ تربیتی پروگرام کا انعقاد خصوصی طور پر ریاست کیرالا کے اردو ذریعۂ تعلیم سے وابستہ اساتذہ کے لیے کیا گیا تھا جس کا مقصد اساتذہ کو شعبۂ تعلیم و تدریس میں ہورہی پیش رفت سے ہم آہنگ کرنا تھا۔ اس تربیتی پروگرام میں کیرالا کے مختلف اضلاع سے تعلق رکھنے والے پچاس اساتذہ نے شرکت کی اور ملک کے ممتاز ماہرین کے دانشورانہ مشوروں سے مستفیض ہوئے جن میں پروفیسر کے آر اقبال احمد، پروفیسر شاہ محمد مظہرالدین فاروقی، ڈاکٹر مرزا شوکت بیگ، ڈاکٹر عبدالقیوم، ڈاکٹر ریاض احمد، جناب اصغر حسین، جناب بشیر احمد، جناب شیخ حبیب الرحمٰن، جناب پی. کے ابوبکر، جناب پی. کے عبدالحمید، جناب این بیرن کٹی، جناب عبدالناصر، جناب پی محمد کٹی، جناب عباس علی اور جناب پی کے شمس الدین کے نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ پروگرام کے مقامی کوآرڈینیٹر، جناب محی الدین کٹی نے شرکا سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کے معیار کو بلند کرنے کی ایک بڑی ذمے داری اساتذہ برادری پر عائد ہوتی ہے کیونکہ انھیں کے ذریعے علم کی روشنی طلبہ تک پہنچتی ہے جس سے طلبہ کے مستقبل کی راہیں روشن ہوتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ اساتذہ کا فریضہ ہے کہ وہ خود کو اکتساب علم میں مصروف رکھیں اور طلبہ کی تدریس پوری لگن، محنت او رایمانداری کے ساتھ کریں تاکہ اردو کو اپنا ذریعۂ تعلیم بنانے والے طلبہ پورے اعتماد کے ساتھ مسابقتی دور کے مبازرات کا مقابلہ کرسکیں۔ مرکز کے اسسٹنٹ پروفیسر جناب مصباح انظر نے کہا کہ کامیاب معلم وہ ہے جو تدریس کے ذریعے بہتر سماج کی تعمیر کا راستہ ہموار کرتا ہے۔ لہٰذا یہ اساتذہ کی ذمے داری ہے کہ وہ صحت مند قومی، علمی اور ادبی روایات کو آئندہ نسلوں تک پہنچائیں۔ اجلاس کی کارروائی کے فرائض بھی جناب محی الدین کٹی نے ادا کیے جبکہ جناب کے. پی شمس الدین نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ واضح رہے کہ مرکز پیشہ ورانہ فروغ برائے اساتذۂ اردو ذریعۂ تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد اپنے قیام سے ہی اردو ذریعۂ تعلیم کے اساتذہ کے پیشہ ورانہ فروغ کے لیے جنوبی ہندوستان کے مختلف مقامات پر مرکز کے ڈائرکٹر پروفیسر شاہ محمد مظہرالدین فاروقی کی راست نگرانی میں تربیتی پروگرام منعقد کرتا رہا ہے جس سے بڑی تعداد میں اساتذہ مستفیض ہورہے ہیں۔ (رہنمائے دکن، حیدرآباد)

اردو اور عصری علوم کی تدریس

● حیدرآباد۔ 17 اگست، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے اردو ذریعۂ تعلیم سے عصری علوم کی تدریس کا جو بیڑا اٹھایا ہے اس کے لیے جدید سائنسی اصطلاحات کی فرہنگ کی تیاری بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اس اہم کام کو محض اردو ماہرین کی عدم دستیابی کا بہانہ بنا کر نظرانداز کردینا نامناسب ہے۔ پروفیسر خالد سعید انچارج وائس چانسلر نے فرہنگ سائنسی اصطلاحات (طبیعیات و نباتیات کے حوالے سے) کے موضوع پر آج یونیورسٹی میں 5 روزہ ورکشاپ کے افتتاحی اجلاس سے صدارتی خطاب کے دوران ان خیالات کا اظہار کیا۔ ڈسٹنس ایجوکیشن کونسل (نئی دہلی) اس ورکشاپ کی اسپانسر ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو عصری علوم اور تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ماہرین دستیاب ہیں۔ مگر ان کی صلاحیتوں کے صحیح استعمال کی ضرورت ہے۔ پروفیسر خالد سعید نے اصطلاحات کی تدوین اور ترویج کے حوالے سے جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ کی گرانقدر خدمات کا حوالہ دیا اور ریمارک کیا کہ کسی بھی زبان کی اصطلاحوں کو رواج دینے کے لیے انتظامی عزم درکار ہوتا ہے۔ انھوں نے ورکشاپ کے انعقاد کو صحیح سمت میں ایک قدم قرار دیتے ہوئے امید ظاہر کی کہ اس ورکشاپ میں تدوین اصطلاحات کے لیے کئی اہم رہنما خطوط وضع کیے جائیں گے۔ انھوں نے نشاندہی کی کہ حالیہ برسوں میں اردو اخبارات بالخصوص حیدرآباد سے شائع ہونے والے موقر روزناموں نے سائنسی مضامین کے ترجمے اور اشاعت کا اہم ترین کام کیا ہے۔ سائنسی اصطلاحات کو رواج دینے کے لیے بھی اردو اخبارات کا تعاون حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اردو یونیورسٹی اب جب کہ فاصلاتی نظام تعلیم سے منسلک طلبہ کے لیے خود اپنا نصاب متعارف کررہی ہے، سائنسی اصطلاحات پر مشتمل ایک ایسی فرہنگ مرتب کرے جو ملک کے مختلف گوشوں میں آباد طلبہ کے لیے قابل قبول اور قابل فہم ہو۔ (صحافت، دہلی)

''شعروحکمت'' کتاب 10 کی دو جلدوں میں اشاعت

● حیدرآباد۔ یکم اگست شہریار اور مغنی تبسم کی ادارت میں ''شعروحکمت'' کتاب 10، دو جلدوں میں شائع ہوچکی ہے۔ اس کتاب کا بڑا حصہ ادیبوں

کے گوشوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں ہمیشہ کی طرح اہل علم و دانش اور تخلیق کاروں کے ایک بڑے طبقے کا قلمی تعاون شامل ہے اردو دنیا کے ممتاز قلم کاروں کی نگارشات اس میں شامل ہیں۔ جن میں انور سعید، احمد ندیم قاسمی، امتیاز احمد، امجد اسلام امجد، ارمان نجمی، احسن رضوی، احمد مشتاق، ابوالکلام قاسمی، بلراج کومل، بیگ احساس، پروین شیر، جینت پرمار، جمیل جالبی، حامدی کاشمیری، حسین الحق، حیدر جعفری سید، رشید امجد، سید محمد اشرف، سید خالد قادری، سیما صغیر، سلیمان اطہر جاوید، سلطانہ مہر، سرور الہدیٰ، سلطان اختر، سلام بن رزّاق، سلیمان خمار، شمیم حنفی، شافع قدوائی، شمس الرحمٰن فاروقی، شکیل الرحمٰن، شفیق فاطمہ شعریٰ، شاہد اختر، صغیر افراہیم، ضیاء الحسن، طارق متین، ظفر گورکھ پوری، عبدالصمد، علیم اللہ حالی، عتیق اللہ، علی ظہیر، عطیہ عابد، عالم خورشید، فکر تونسوی، فہمیدہ ریاض، فیروز عالم، فاطمہ تاج، قاضی جمال حسین، قمر جمالی، قاضی افضال حسین، گوپی چند نارنگ، لطف الرحمٰن، مہدی جعفر، مخمور سعیدی، منیب الرحمٰن، محمد علی صدیقی، مصحف اقبال توصیفی، معراج رعنا، مدحت الاختر، مہتاب حیدر نقوی، مرزا حامد بیگ، ناصر بغدادی، ناصر عباس نیر، وارث کرمانی، وزیر آغا، وہاب اشرفی، اور زبیر شادات شامل ہیں۔ یہ کتاب 6-3-659/2 کپاڈیا لین، سوماجی گوڑہ حیدرآباد 5000082 اے پی انڈیا، Flat No. 101، سفینہ کامپلکس، میڈیکل روڈ، علی گڑھ یوپی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 3108، گلی وکیل کوچہ پنڈت لال کنواں دہلی پر فروخت کے لیے دستیاب ہے۔

(منصف، حیدرآباد)

اعزاز و اکرام

حبیب تنویر اور بھیم سین جوشی کو لائف اچیومنٹ ایوارڈ

● نئی دہلی۔ 31 اگست، دہلی کابینہ نے آج اپنی میٹنگ میں معروف اردو ہندی ڈراما نگار مرحوم حبیب تنویر اور بھارت رتن پنڈت بھیم سین جوشی کو لائف اچیومنٹ ایوارڈ دینے کی منظوری دے دی ہے۔ وزیر اعلیٰ شیلا دکشت کی صدارت میں منعقدہ میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا۔ میٹنگ میں موجود صحافیوں کو مزید معلومات فراہم کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ سرکار کا محکمہ فن و ثقافت نے ساہتیہ کلا پریشد کے زیر اہتمام پنڈت بھیم سین جوشی اور مرحوم حبیب تنویر کو لائف اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازنے کا فیصلہ لیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ پنڈت بھیم سین جوشی ہندوستانی شاستری سنگیت کے عظیم فنکار ہیں۔ کیرانہ گھرانے کے جوشی خیال گلوکاری کے لیے معروف ہیں اور بھکتی سنگیت میں بھجن گلوکاری میں انھیں مہارت حاصل ہے۔ انھوں نے بسنت بہار، بیربل مائی برادر، تانسین اور کئی فلموں میں نغمے بھی لکھے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ پنڈت جوشی نے قومی اتحاد پر مبنی ویڈیو "ملے سر میرا تمھارا" میں ابتدائی آواز دی۔ ان کی انھیں خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے 2008 میں بھارت رتن ایوارڈ دیا گیا۔ اس کے علاوہ بھی انھیں کئی اہم ایوارڈ سے نوازا جاچکا ہے۔ انھوں نے کہا کہ حبیب تنویر کو بھی ان کے انتقال کے بعد ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لائف اچیومنٹ ایوارڈ دینے کا فیصلہ لیا گیا ہے جو اردو اور ہندی کے معروف ڈراما نگار تھے، اس کے علاوہ وہ ایک اچھے ہدایت کار، اداکار اور شاعر بھی تھے۔ انھوں نے آگرہ بازار، چرن داس چور، جیسے کئی اہم ڈرامے تخلیق کیے ہیں۔ انھوں نے 1959 میں بھوپال میں نیا تھیٹر قائم کیا اور چھتیس گڑھ کے قبائلی لوگوں کے درمیان ڈرامے کے شعبے میں کام کیا۔ ان کا خیال تھا کہ ڈرامہ حقیقت میں گاؤں میں نظر آتا ہے۔ انھیں کئی ملکی اور غیر ملکی ایوارڈ سے نوازا گیا جن میں پدم شری اور سنگیت ناٹک پرسکار شامل ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اس ایواڈ سے مذکورہ بالا شخصیات کے علاوہ سبو لکشمی، استاد فہیم الدین خان ڈاگر، ابراہم الکاجی، ڈاکٹر کپلا واتسائن اور زہرا سہگل کو نوازا جاچکا ہے۔

(ہمارا سماج، دہلی)

● انبالہ۔ 19 اگست، ہریانہ وقف بورڈ نے پنجاب یونیورسٹی کے فائن آرٹ شعبے کے سابق پروفیسر ڈاکٹر نریش کو خواجہ الطاف حسین حالی ایوارڈ سے نوازا ہے۔ ڈاکٹر نریش کو یہ ایوارڈ اردو ادب کو فروغ دینے کے اعتراف میں دیا گیا ہے۔ ایوارڈ تفویض تقریب وقف بورڈ کے انبالہ چھاؤنی میں واقع ہیڈ کوارٹر میں منعقد ہوئی۔ تقریب کی صدارت بورڈ کے منتظم نسیم احمد اور نظامت عاشق علی خاں اور عبدالسمیع انصاری نے کی۔ اس موقع پر نسیم احمد کے ہاتھوں ڈاکٹر نریش کو ایوارڈ کیا گیا جو 10 ہزار روپے نقد، ایک مومنٹو، شال اور یادگاری تحفے پر مشتمل تھا۔ ہریانہ وقف بورڈ کے منتظم اعلیٰ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر نریش کو اردو ادب میں گرانقدر خدمات کے لیے ایوارڈ دیا گیا ہے۔ وہ 70 سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے کئی مستند کتابوں کو ایڈٹ بھی کیا ہے۔ یہ ایوارڈ اردو ادب کے فروغ کے لیے ہر سال دیا جاتا ہے۔ اس تقریب میں بڑی تعداد میں محبان اردو شریک تھے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مختصرات

● بدھان چندر کالج آسنسول کے شعبۂ اردو کی جانب سے 11 اگست 2009 کو یک روزہ ریاستی سیمینار بعنوان "غالب، فن اور شخصیت" کا انعقاد کیا گیا۔ اعزازی مہمان بردوان یونیورسٹی کے انسپکٹر آف کالجز ڈاکٹر دیب کمار پانجا تھے۔ صدارت ڈاکٹر گوتم بنرجی پرنسپل بدھان چندر کالج آسنسول نے کی۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر جمیل احمد نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر گوتم

بنرجی نے کہا کہ غالب ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کی غزلیں اور ان کی تحریریں آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں اور قیامت تک موجود رہیں گی۔ ڈاکٹر دیپ کمار پانجا نے کہا کہ بردوان یونیورسٹی نے اس کالج میں اردو آنرز کا شعبہ قائم کر کے صحیح قدم اٹھایا تھا اس کا اندازہ آج کے سیمینار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے اگر اس کالج کو مزید سہولتیں مہیا کرائی جائیں تو اردو کے کاز کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوں گی۔ انھوں نے کہا کہ اگر کالج کے پرنسپل تھوڑی بہت کوشش کریں تو اس کالج میں اردو میں پوسٹ گریجویٹ کا شعبہ قائم ہوسکتا ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ اس سیمینار میں مقرر خاص کی حیثیت سے پٹنہ کے اے.این کالج کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر منظر اعجاز نے غالب کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ مرزا غالب کی زندگی، آزاد مشربی، ان کا فکری سفر، ان کی شاعری اور نثر نگاری ہماری تہذیب کا ایسا سرمایہ ہے جس کی دید و دریافت ہر عہد میں ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ ان کا سیکولر مزاج، مشترکہ تہذیبی قدروں پر اعتماد، عام انسانوں سے لگاؤ، دوستوں، شاگردوں اور اہل خانہ سے محبت، اخلاق اور دردمندی، ان کی ذاتی زندگی کی محرومیاں، تشنہ کامیاں، رسوائیاں اور ایک پرآشوب دور میں جینے کی تگ و دو یہ سب چیزیں غالب کی پہچان ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق اعظمی (آسنسول) نے ''غالب: نشاط زیست کا شاعر'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا اور غالب کی منفرد شخصیت اور شاعرانہ عظمت کے نقوش کو اجاگر کیا۔ آخر میں شعبۂ اردو کے ندیم اختر نے اظہار تشکر کیا اور شکیل احمد نے مہمانوں کو رخصت کیا۔ (ڈاک سے)

● سیتامڑھی۔ 26 اگست، صوبے میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملے 28 سال ہوگئے، لیکن صوبائی حکومت کے محکموں اور دفتروں میں اردو خستہ حال ہے۔ حالت یہ ہے کہ کمشنری سے لے کر بلاک آفس تک بحال اردو ترجمان، معاون ترجمان، و ٹائپ رائٹر وغیرہ سے اردو کا کام نہیں لیا جارہا ہے، ان ملازموں سے متعلق افسران آفس کا دوسرا کام لیتے ہیں افسروں کے نام تختی بھی اردو میں نہیں ملے گی۔ اس بابت بہار ورکنگ جرنلسٹ یونین نے وزیراعلیٰ نتیش کمار سے اخبار کے توسط سے درخواست کی ہے کہ صوبے میں اردو کی بدحالی کو دور کیا جائے۔ یونین کے کنوینر صلاح الدین خان نے بتایا کہ صوبائی حکومت کا کوئی بھی ایسا محکمہ نہیں ہے جسے اردو کو قانونی حق دینے کے معاملے میں بطور نمونہ پیش کیا جائے۔ وزیراعلیٰ کو متوجہ کرتے ہوئے جناب خان نے کہا کہ سرکار اگر وقت رہتے اردو کی ترقی پر دھیان نہیں دیتی ہے تو مشترکہ تہذیب کی یہ زبان ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گی، جس سے ایک بڑی آبادی متاثر ہوگی انھوں نے کہا کہ اردو نیدیشالے کا کام اردو ملازمین کی تنخواہ، ان کے تبادلے اور ان کے متعلق دیگر معاملوں کے نپٹارے تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

(ہمارا سماج، دہلی)

● بنگلور۔ ''انجمن خوش دلان کرناٹک اور اس کے دو ماہی رسالے ''ظرافت'' کی وجہ سے ہماری ریاست کرناٹک بھی پورے ملک میں اب طنز و مزاح کے حوالے سے جانی پہچانی جارہی ہے۔'' اس خیال کا اظہار کرناٹک اردو اکادمی کے سابق صدر پروفیسر م.ن.سعید نے ''ظرافت'' کے خصوصی شمارے کی تقریب رسم رونمائی میں کیا۔ انھوں نے خصوصی شمارے کا اجرا کرتے ہوئے اس امر پر مسرت کا اظہار کیا کہ انجمن کرناٹک میں طنز و مزاح کے فروغ کے لیے مثبت کام کررہی ہے اور انجمن کے ماہانہ ادبی اجلاس کی وجہ سے ریاست کے چند سنجیدہ ادب لکھنے والے بھی طنز و مزاح کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ خالص مزاح لکھنا نہایت ہی مشکل کام ہے لیکن یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ ریاست کے ظرافت نگار اس میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔

جلسے میں شریک مہمان خصوصی ہندی کے مشہور ادیب جناب پی.این.جھا نے ہندی زبان میں طنز و مزاح کی ابتدا و ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے ہندی میں ظریفانہ ادب کے عصری منظرنامے پر روشنی ڈالی۔ موصوف نے کہا کہ انھیں یہ جان کر مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ اس انجمن نے پانچ سال کے قلیل عرصے میں ملک گیر سطح پر اپنی شناخت بنالی ہے اور ''ظرافت'' پابندی سے چھپ رہا ہے۔ ڈاکٹر راہی فدائی نے کہا کہ ہمارے پیغمبر حضرت محمد کو بھی انسانی زندگی میں مزاح کی اہمیت کا احساس تھا اور وہ ایسے مزاح کی حوصلہ افزائی کرتے تھے جس سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ انجمن اور جلسے کی صدر ڈاکٹر زبیدہ بیگم نے خصوصی شمارے کی اشاعت میں سبھی اراکین انجمن کے تعاون پر تشکر کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اب تک جناب عظیم الدین عظیم کی ادارت میں ظرافت کے 23 شمارے شائع ہوچکے ہیں۔ چوبیسواں اور پچیسواں شمارہ مشترکہ اور خصوصی ہے۔ صدارتی تقریر کے بعد جناب مشتاق سعید نے اپنا طنزیہ و مزاحیہ مضمون ''اندھیر نگری۔ چوپٹ راج'' پیش کیا۔ جناب محمد ہارون سیٹھ سلیم، جناب راج پریمی، جناب مشتاق احمد شاہ، جناب محمود خان قیصر، جناب نذیر نصرت ہنگامہ، جناب گیان چند مرمکیا، جناب امیر احمد اقیر اور جناب سید امجد عمر برق حیدرآبادی نے اپنا ظریفانہ کلام سنا کر داد و تحسین حاصل کی۔

اجلاس میں نامور مزاح نگار یوسف ناظم اور معروف مزاحیہ شاعر بازغ بہاری کی رحلت پر رنج و ملال کا اظہار کرتے ہوئے ان کی مغفرت کے لیے کی گئی۔

(ڈاک سے)

● انجمن محبان فروغ اردو گورکھپور کی بائیسویں ماہانہ میٹنگ ناصر لائبریری

گورکھپور میں ہوئی۔ جس کی صدارت محمد یعقوب فاروقی نے اور نظامت روشن صدیقی نے کی۔

اس میٹنگ میں متفقہ فیصلہ کیا گیا کہ مرکزی حکومت کے وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کو شکریے کا خط بھیجا جائے۔ ماضی قریب میں نو ودے ودیالیہ کمیٹی کی طرف سے فرمان جاری کرکے یو۔ پی۔ کے چھ اضلاع میں سہ لسانی فارمولہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اردو زبان کو ختم کیا گیا تھا اور اس کی جگہ غیر علاقائی زبانوں کو شامل کیا گیا تھا۔ جس کے خلاف محبان اردو کی طرف سے سخت احتجاج ہوا اور اب مرکزی وزیر کی مداخلت سے مذکورہ احکام کو فی الفور واپس لے لیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اراکین انجمن نے اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں جہاں جہاں نو ودے ودیالیہ سے اردو کو ختم کیا گیا ہے وہاں بھی ازسرنو بحال کیا جائے۔ انجمن نے مختلف صوبوں کے اردو عوام و خواص سے اپنے اپنے صوبوں میں یو۔ پی۔ کی طرح تحریک چلانے کی اپیل کی، تاکہ اردو کے ساتھ ہو رہی ناانصافی کا سلسلہ ختم ہو۔

میٹنگ میں شرکت کرنے والوں میں محمد افراہیم، سید نورالحسن، مقبول حسن لاری، خالد حبیب، ڈاکٹر اشہد کریم، ڈاکٹر نفیس احمد رضوی، محمد ندیم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ (ڈاک سے)

مشاعرے

● نئی دہلی۔ 17 اگست، اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام گذشتہ رات ایوان غالب میں کل ہند مشاعرہ جشن آزادی کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت معروف شاعر پدم شری بیکل اتساہی اور گلزار دہلوی نے کی جبکہ نظامت معین شاداب نے کی۔ مشاعرے کا افتتاح کرتے ہوئے اکادمی کے قائم مقام وائس چیئرمین سید شریف الحسن نقوی نے مشاعروں کی روایت اور ان کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ کس طرح اردو زبان اور اردو شعرا نے تحریک آزادی میں اہم رول ادا کیا۔ شریک شعرا تھے: پروفیسر وسیم بریلوی، مخمور سعیدی، منور رانا، معراج فیض آبادی، ڈاکٹر نسیم نکہت، اعجاز پاپولر، رؤف خیر، فاروق انجینئر، شہپر رسول، نوشہ امروہوی، قمر سنبھلی، شہباز ندیم ضیائی، سلیم صدیقی، معین شاداب، اقبال اشہر، انور باری، ناشاد اورنگ آبادی، سیفی سرونجی، ڈاکٹر ضیا رانا، عادل رشید۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 18 اگست، انجمن عروج ادب کی جانب سے ایوان غالب میں 51 ویں مشاعرہ جشن آزادی کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت اقلیتی تعلیمی اداروں کے قومی کمیشن کے چیئرمین جسٹس محمد سہیل اعجاز صدیقی نے کی۔ انھوں نے شاعری کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے زندگی کو خوبصورت بنانے کے لیے باہمی مکالمے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ آج کا انسان ایک خوفناک اور تناؤ بھرے ماحول میں سانس لے رہا ہے جس کے اثرات عہد حاضر کی شاعری پر بھی پڑ رہے ہیں۔ مشاعرے کے کنوینر ڈاکٹر عزیز احمد صدیقی نے تعارفی کلمات میں کہا کہ ہندستان کی وہ مشترکہ تہذیب جس میں انسان کو انسان کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے وہ دہلی کے معاشرے اور اس کی سماجی فکر کی روح ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو تعلیم کے چلن میں کمی کے باوجود اردو تہذیب آج بھی زندہ ہے اور اسے زندہ رکھنے میں مشاعروں کا اہم کردار ہے۔ مشاعرے کی نظامت معین شاداب نے کی۔ جن شعرا نے شرکت کی ان کے اسمائے گرامی ہیں: گلزار دہلوی، بیکل اتساہی، راحت اندروی، مخمور سعیدی، معراج فیض آبادی، منظر بھوپالی، جوہر کانپوری، سلیم صدیقی، معین شاداب، سلمیٰ شاہین، اشوک ساحل، اعجاز پاپولر، مظفر رزمی، شبینہ ادیب، سکندر حیات گڑبڑ، راج گوپال سنگھ، لکشمی شنکر واجپئی، مہندر شرما۔ عروج ادب کے صدر ایل نارنگ ساقی، جنرل سکریٹری ایس کے بھٹناگر سمیت انجمن کے بیشتر عہدیداران اس موقع پر موجود تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 15 اگست، جامعہ ملیہ اسلامیہ آؤٹ ریچ پروگرام کے تحت جشن آزادی کے موقع پر ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس میں شیخ الجامعہ پروفیسر مشیرالحسن نے آزادی کی 62 ویں سالگرہ کی مبارک باد پیش کی اور آزادی میں جامعہ کے کردار پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ مشاعرے کی صدارت پروفیسر اختر الواسع نے اور نظامت عمیر منظر نے کی۔ مندرجہ ذیل شعرا شریک ہوئے: محمد یونس پاپا، کوثر مظہری، غضنفر، شہپر رسول، سریندر سنگھ شجر، اقبال فردوسی، احمد محفوظ، سلمیٰ شاہین، نگار عظیم، پرویز مظفر، عمیر منظر، نعمان شوق، مشاعرہ کا آغاز خالد مبشر نے اپنی نظم ''میں اردو زبان ہوں'' سے کیا۔ آخر میں آؤٹ ریچ پروگرام کی ڈائرکٹر اور کوآرڈی نیٹر رخشندہ جلیل نے کلمات تشکر ادا کیے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 24 اگست، ڈاکٹر ذاکر حسین کالج، دہلی یونیورسٹی میں آج بزم مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا جس میں ممتاز و مقبول شاعر مخمور سعیدی نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ یہ مشاعرہ ساہتیہ اکادمی اور دی پوئیٹری سوسائٹی انڈیا کے اشتراک سے کالج میں منعقد کیا گیا تھا۔ بزم کی صدارت کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اسلم پرویز نے کی اور نظامت کا فریضہ عبدالعزیز نے انجام دیا۔ اس موقع پر مہمان خصوصی نے اپنے کلام سے حاضرین کو خوب محظوظ کیا۔ انھوں نے اپنی چند نظمیں بعنوان بے آنگن نسلیں، آخری بس، ہندوستان اور اے ارض وطن، پیش کیں۔ دیگر شعرا حضرات میں ڈاکٹر خالد علوی، ڈاکٹر نجمہ رحمانی، ڈاکٹر جعفر احراری، ڈاکٹر محمد عالم اور شعبہ معاشیات کی استاد ڈاکٹر سیمی نے اپنا کلام پیش کیا۔ آخر میں صدر شعبۂ اردو، ذاکر حسین کالج ڈاکٹر شاہ عالم نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (صحافت، دہلی)

● جے پور۔ 31 جولائی 2009، ادبی تنظیم ''آبشار'' کے زیراہتمام آفیسرز ٹریننگ اسکول (او.ٹی.ایس) میں کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت مخمور سعیدی نے کی۔ مہمان خصوصی راجستھان کے وزیر صحت عمادالدین احمد خاں عرف درّو میاں، مہمان امتیازی راجستھان ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس اور آبشار کے سرپرست مکھراج کلا تھے۔ مشاعرے کے آغاز میں فاروق انجینئر نے تنظیم کے اغراض و مقاصد کا ذکر کیا۔ دلی ہائی کورٹ کے جسٹس جسپال سنگھ، راجستھان ہائی کورٹ کے سابق جج آئی ایس اسرانی، درّو میاں اور مکھراج کلا نے شعرا کا استقبال کیا۔ آخر میں آبشار کے سکریٹری عادل رضا منصوری نے شکریہ ادا کیا۔ نظامت شین کاف نظام نے کی۔ مشاعرے میں مندرجہ ذیل شعرا نے شرکت کی۔

مخمور سعیدی، شہریار، حسن کمال، شین کاف نظام، شاہد میر، اے ڈی راہی، ناظم نقوی، مدن موہن دانش، نجمی فتحپوری، شمیم بیکانیری، فاروق انجینئر، ڈاکٹر نثار راہی، محمد افضل جودھپوری، اشراق الاسلام ماہر، برجیش عنبر، عادل رضا منصوی، مہیندر۔ (ڈاک سے)

● بھوپال۔ 12 اگست، ادبی تنظیم تہذیب کے جشن سالگرہ پر ایک شعری نشست گذشتہ دنوں میں منعقد ہوئی جس میں رشید قریشی (مدیر ماہنامہ لاریب لکھنؤ) اور ڈاکٹر عامر قدوائی (مقیم حال کویت) نے خصوصی طور پر شرکت فرمائی۔ نشست کی صدارت نسیم انصاری نے کی۔ نظامت کے فرائض عارف علی عارف نے ادا کیے۔ ابتدا میں تنظیم کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر انجم بارہ بنکوی نے مولانا حبیب ریحان ندوی کے سانحہ ارتحال پر تعزیتی کلمات ادا کرتے ہوئے سامعین سے مولانا کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے فاتحہ خوانی کی درخواست کی۔ بعد ایصال ثواب جلسے کی کاروائی کے تحت ڈاکٹر انجم بارہ بنکوی نے لکھنؤ سے تشریف لائے مہمانوں کا تعارف کراتے ہوئے صدر اور مہمانوں کی گلپوشی کی رسم ادا کی۔ تہذیب کے صدر اختر وامق نے اس موقع پر رشید قریشی اور ڈاکٹر عامر قدوائی کا استقبال شال پیش کر کے کیا۔ نشست میں معروف افسانہ نگار اقبال مجید، پروفیسر اظہر راہی، سید طحہٰ پاشا، ریاض احمد، انور حسین انور، عبدالمنان، حسن بھائی، خورشید اختر، سید ساجد علی، اطہر پاشا، عزیز خان اور دیگر ادب دوست حضرات شریک تھے۔ نشست میں نسیم انصاری نے اپنی نظمیں کتب خانہ اور کتبہ پیش کرتے ہوئے اپنے حالیہ دورۂ پاکستان اور وہاں کی ادبی شعری صورت حال کا ایک جائزہ پیش کیا۔ مہمان ڈاکٹر عامر قدوائی کی نظموں کو بھی خوب سراہا گیا۔

شعری نشست میں عشرت قادری، ڈاکٹر شاہد میر، ڈاکٹر مختار شمیم، ظفر صہبائی، ضیاء فاروقی، امتیاز انجم، رشید قریشی، ڈاکٹر عامر قدائی، ڈاکٹر انجم، رشید قریشی، ڈاکٹر عامر قدائی، ڈاکٹر انجم بارہ بنکوی، بدر واسطی، قاضی ملک نوید، اقبال بیدار، رشید اختر، علی عباس امید، سعید اختر، ڈاکٹر اعظم، وجے تواری، اکبر جبلپوری، ساجد پریمی، کاظم رضا راہی، احمد الدین اشرف، رفیق بکس، غفران ہمدم، احسان وارثی اطہر، سلیم دانش نے اپنا معیاری کلام سنایا۔

(ندیم، بھوپال)

● بنگلور۔ 10 اگست، ادبی ادارے نثر نگاروں کو بھی فوقیت دیں، کیونکہ آج ادبی دنیا میں شعرا کی تعداد تو حسب توقع ہے، مگر نثر نگاروں کی قلت شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔ روزنامہ سالار ادبی ایڈیشن کے مدیر محمد اقبال نے اتوار کی شام القدس اردو ہال عیدگاہ کامپلکس میں کاروان اردو ادب کے 80 ویں طرحی وغیرہ طرحی نعتیہ مشاعرے میں بطور مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا۔ ساتھ ہی آپ نے کاروان اردو ادب کے روح رواں سردار وہاب دانش اور ان کے ساتھیوں کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ موسم بہار میں پھولوں کا جمع کرنا کوئی کمال نہیں موسم خزاں میں گلشن کی آبیاری دل گردے کا کام ہے، آج کے اس دور میں اردو کی خدمت کرنا بھی ایسا ہی ہے۔ صدر مشاعرہ جناب منیر احمد جامی نے اپنے صدارتی خطاب میں محمد اقبال کے مشوروں کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ آج نوجوانوں میں اردو سے دلچسپی پیدا کرنے اور ادب کی جانب رجحان بڑھانے کی ضرورت ہے۔ مشاعرے کا آغاز قاری تبریز احمد کی قرأت سے ہوا۔ جناب دادا سیٹھ نے حمد باری تعالیٰ سنائی۔ نوید پاشاہ نے نعت سنائی۔ جناب سردار دانش نے خیر مقدمی تقریر کے بعد ایک اور مہمان خصوصی قاری رضوان بیگ شمسی کو قرأت کی دعوت دی۔ آپ نے اپنے مخصوص انداز میں تلاوت کلام پاک سے ماحول کو پُرنور بنا دیا۔ جناب ریاض احمد خمار، فیاض قریشی، شاہنواز میسور، قاسم سہیل قریشی اور حمید راہی بطور مہمانان خصوصی شریک رہے۔ جناب محمد ہدایت اللہ سکندر کی نظامت میں درج ذیل شعرا نے اپنا نعتیہ کلام سنایا۔ منیر احمد جامی، انور عزیز، الیاس راحت، الحاج مبین منور، نذیر نصرت، راز عمری، ڈاکٹر احمد اللہ حمید، ندیم فاروقی، ریاض احمد خمار، قاری رضوان اللہ بیگ شمسی، صفدر علی خاں تاج اشرفی، مشتاق احمد شاہ، عبدالقادر عارف منڈیا، مشتاق احمد مشتاق، نیاز الدین نیاز، ہدایت اللہ سکندر، برہان الدین برہان، رحمت بنگلوری، محمد ابراہیم عارف، سعید احمد سعید، سردار دانش، مختار احمد مختار، امیر پنساری، محمد شفیع، رفیق احمد اختر۔

(سیاست، بنگلور)

● حیدرآباد۔ 18 اگست، جدہ سے آئے ہوئے حیدرآبادی غیر مقیم ہندوستانی سید یعقوب اسد کے زیراہتمام ایک محفل شعروسخن کا عزیزیہ فنکشن ہال ملک پیٹ میں انعقاد عمل میں آیا۔ طالب خوندمیری نے صدارت کی۔ جلیل

دینتجوی جمال قادری اور علیم خان فلکی مہمانانِ خصوصی تھے۔ یعقوب اسد نے شعرا اور سامعین کا خیر مقدم کرتے ہوئے اردو مشاعرے کی افادیت اور اس کے معیار کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اس یقین کا اظہار کیا کہ اردو زبان کا مستقبل شاندار ہے۔ موصوف نے یوسف ناظم، ڈاکٹر سید عبدالمنان اور منوہر راج سکسینہ ایڈوکیٹ کے سانحۂ ارتحال پر اظہار افسوس کیا اور اردو کے تئیں ان کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا۔ محفل کا آغاز سید عطا اللہ مجاہد کی قرأت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد خالد اقبال نے حمدیہ اشعار اور سبحان خوندمیری نے نعت پیش کی۔ شہزاد مہدی ضیا نے کارروائی چلائی۔ جن شعرا نے کلام سنا کر داد تحسین حاصل کی ان میں طالب خوندمیری (صدر محفل) خلیل دینتجوی (گجرات) عباس دانا، رؤف خلش، محسن جلگانوی، مسرور عابدی، مظہر رضی، سفیان قاضی (احمد آباد) سہیل عظیم، علیم خان فلکی، سید جمیل احمد، عبدالغفار خداداد، یوسف روش، شریف اطہر، سردار اثر، نثار مہدی علی خان، طالب سندوزئی، عزیز حسین عزیز، سمیع اللہ حسینی سمیع، سید علی بے خود، قدیر انصاری، شیراز مہدی ضیا (معتمد مشاعرہ) ضیاء الدین ضیا، سید علی عادل اور سید جلیس شامل تھے۔ سید عطاء اللہ مجاہد کے شکریے پر محفل اختتام کو پہنچی۔

(منصف، حیدرآباد)

رسم اجرا

● نئی دہلی۔ 20 اگست، معروف قانون داں اور علمی شخصیت سید عاصم علی سبزواری کی تصنیف ''اس دور کے مسلمانوں میں علم اور دین کا ناقص تصور'' کا اجرا آج یہاں اردو پریس کلب کے زیر اہتمام منعقدہ ایک پروقار تقریب میں جامعہ ہمدرد کے چانسلر سید حامد کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ اس موقع پر انھوں نے کہا کہ کتاب اس بات کا پیغام دیتی ہے کہ قرآن صرف دین کی تعلیم کے حصول تک محدود رہنے کا حکم نہیں دیتا بلکہ دنیوی علوم میں بھی مہارت کا درس دیتا ہے۔ پروفیسر طاہر محمود نے علم کو صرف علم دین تک محدود کرنے کو غیر اسلامی اور غیر قرآنی بتاتے ہوئے اپنی زندگی کو قرآن کریم کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت پر زور دیا۔

پروفیسر اخترالواسع نے علم کو مختلف خانوں میں تقسیم کرنے کو غلط ٹھہرایا۔ انھوں نے کہا کہ علم کی صرف دو قسمیں ہیں علم نافع اور علم غیر نافع۔ اردو پریس کلب کے چیئرمین عبدالرشید شاہین نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ سید عاصم علی سبزواری نے اپنی کتاب کے ذریعے بہت احتیاط کے ساتھ غور وفکر کا دروازہ وا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کے مصنف سید عاصم علی سبزواری نے علم کے حصول پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اس کتاب میں انھوں نے قرآن و حدیث کی روشنی میں اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ دور میں مسلمانوں کے اندر علم اور دین کا تصور ناقص ہے۔

اس کے علاوہ کمال فاروقی، سید کوکب حمید، ڈاکٹر معراج الدین، چندر بھان خیال نے بھی اظہار خیال کیا۔ عظیم اختر نے تعارفی کلمات پیش کیے۔ عبدالماجد نظامی اور اردو پریس کلب کے سکریٹری طارق فیضی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ نظامت معین شاداب نے کی۔ گاندھی پیس فاؤنڈیشن میں منعقد رسم اجرا کے جلسے میں امریکی سفارت خانے کے انفارمیشن آفیسر ٹونی گوڈ، اوپین کے ڈائرکٹر سید ظفر حسن، مخمور سعیدی، مودود صدیقی، سید طالب زیدی، منظور عثمانی، احمد علوی، ڈاکٹر ایم آر قاسمی، ایس ایم ظفر، حسین ماجد، اقبال احمد ایڈووکیٹ، رشید الدین، مسعود ظفر، ڈاکٹر جنید صدیقی، کنور نیاز محمد (بیکانیر) بلال سبزواری، عاصم اور دانش علیم سمیت مختلف سرکردہ شخصیات بڑی تعداد میں موجود تھیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● حیدرآباد۔ 21 جولائی، تحقیق کے فن کو اگرچہ جامعات میں فروغ کا موقع ملا لیکن جامعہ عثمانیہ کے توسط سے اس فن کو عام کرنے میں عثمانین کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جامعہ عثمانیہ کے ایک ایسے ہی نمایاں سپوت ڈاکٹر سید بشیر احمد ہیں جن کی چھٹی کتاب ''اردو کے روشن مینار'' کی رسم رونمائی روزنامہ ''سیاست'' کے گولڈن جوبلی ہال میں بروز ہفتہ شام 7 بجے بدست الحاج محمد رحیم الدین انصاری صدر نشین اردو اکادمی انجام پائی۔ اس تقریب رونمائی کی صدارت پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے کی۔ قدیر انصاری نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے جامعہ عثمانیہ کے استاد ڈاکٹر مجید بیدار کو اظہار خیال کی دعوت دی۔ پروفیسر مجید بیدار نے کہا کہ جامعہ عثمانیہ کے تلامذہ میں ڈاکٹر بشیر احمد اس لیے اہمیت کے حامل ہیں کہ انھوں نے اس جامعہ کے ماہر اساتذہ کے رویے یعنی تصنیف و تالیف اور تحقیق و تنقید کو اختیار کیا ہے۔ ڈاکٹر تنویر الدین احمد خدانمائی صدر شعبۂ فارسی جامعہ عثمانیہ نے ڈاکٹر سید بشیر احمد کی تصنیفی صلاحیتوں کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے ادب اور مذہب کے مستحکم رابطے کو نمایاں کیا ہے جو اردو ادب کے روشن مینار کی خصوصیت ہے۔ پروفیسر فاطمہ پروین صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے اردو کے روشن مینار کے مشمولات کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا کہ ڈاکٹر بشیر احمد کی صلاحیتوں میں بلا کا توازن ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی کتاب میں امیر خسرو سے لے کر پروین شاکر کی شاعری تک کا محاکمہ کرنے میں کامیاب ہیں۔ علامہ اعجاز فرخ نے کہا کہ زمانے اور ادوار کے بدلتے رجحانات سے آگاہی کے بعد ہی کسی کی تحریر میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے اور یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ ڈاکٹر سید بشیر احمد اس کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں۔ یوسف روش اور غضنفر

باقری نے منظوم تہنیت پیش کی۔ الحاج رحیم الدین انصاری نے علوم وفنون اور ان کی فضیلت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ دور حاضر میں علوم وفنون کی کثرت ہے اور ڈاکٹر سید بشیر احمد اس لیے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ اپنے سرمائے محنت اور صلاحیتوں کو علوم وفنون کی ترقی وترویج میں استعمال کررہے ہیں۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے کہا کہ ادب اور اس کی تمام شعری و نثری اصناف سے واقفیت کی بنیاد ڈاکٹر سید بشیر احمد کی تحریری کاوشیں وجود میں آرہی ہیں اور روزنامہ ''سیاست'' کے ادبی کالم کی زینت بن رہی ہیں۔ انھوں نے اس تقریب میں ڈاکٹر سید عبدالمنان اور منوہر راج سکسینہ کی رحلت پر تعزیتی قرارداد بھی پیش کی گئی۔ (منصف، حیدرآباد)

● مالیگاؤں۔ رحمانی پبلی کیشنز کی شائع کردہ ڈاکٹر الیاس صدیقی کی کتاب ''شعرفہمی اور فن شاعری'' اور وکیل نجیب کی چار کتابوں: معصوم بجوکا (ناول)، کمپیوتان (ناول دوسرا ایڈیشن)، واپسی (ناولٹ) اور ماں کی بددعا (کہانیوں کا مجموعہ) کے اجرا کی تقریب اے ٹی ٹی ہائی اسکول اور جونیئر کالج کے وسیع ہال میں منعقد ہوئی۔ صدارت کے فرائض ڈاکٹر منظور حسین ایوبی نے انجام دیے۔ سب سے پہلے وکیل نجیب کے نئے ناول ''معصوم بجوکا'' کا اجرا جناب رشید آرٹسٹ نے کیا محترم اسحق خضر کے ہاتھوں ''کمپیوتان'' کے دوسرے ایڈیشن کا اجرا عمل میں آیا۔ ''واپسی'' کے اجرا کی رسم خیال انصاری صاحب نے ادا کی۔ ''ماں کی بددعا'' کے اجرا کے لیے جناب جمیل کرانتی کو زحمت دی گئی جبکہ ڈاکٹر الیاس صدیقی وسیم مالیگانوی کی نئی کتاب ''شعرفہمی اور فن شاعری'' کا اجرا جناب یم مبین (بھیونڈی) کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقع پر مختلف اداروں کی جانب سے وکیل نجیب صاحب کا اعزاز واستقبال کیا گیا۔ جلسے میں جناب ہارون بی۔اے، جناب سراج دلار، جناب اسحق خضر، جناب جمیل کرانتی، جناب احمد عثمانی، جناب ایم مبین، جناب رشید آرٹسٹ، جناب خیال انصاری، ڈاکٹر الیاس صدیقی، ڈاکٹر اشفاق انجم اور ڈاکٹر اقبال برکی نے کتابوں کے تعلق سے اور بالخصوص وکیل نجیب کی ناول نگاری کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں جناب وکیل نجیب نے ناول ''معصوم بجوکا'' پر اٹھائے گئے سوالات کے جواب دیے نیز اپنی ناول نگاری کے تعلق سے اہم باتیں بیان کیں ساتھ ہی اجرا کے پروگرام کے لیے بانیان جلسہ واہل مالیگاؤں کا شکریہ ادا کیا۔

صدر جلسہ ڈاکٹر منظور حسن ایوبی صاحب نے مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے التوا میں پڑے کاموں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ مالیگاؤں میں ایسے ادب دوست موجود ہیں کہ اکادمی کی طرف ہمیں آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مالیگاؤں کی علمی وادبی کارگذاریوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر منظور حسن ایوبی نے مالیگاؤں کے ادبا وشعرا کو مبارکباد دی، خاص طور سے ادب اطفال کے فروغ کے لیے رحمانی سلیم احمد کی خدمات کو سراہا اور ڈھائی ہزار روپے کی کتابیں خریدیں۔

رحمانی سلیم احمد نے اپنے ادارے رحمانی پبلی کیشنز کی جانب سے طبع شدہ 400 کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ اہل مالیگاؤں اور اہل اردو کی پذیرائی سے ہی یہ کام ممکن ہوسکا۔ چار گھنٹے چلنے والی اس تقریب کی نظامت جناب یٰسین اعظمی نے کی جبکہ ہدیۂ تشکر گلشن اطفال کے نائب مدیر جناب یٰسین ملی نے پیش کیا۔ (ڈاک سے)

جانے والوں کی یاد میں

جمنا داس اختر

● نئی دہلی۔ 3 ستمبر۔ اردو کے بزرگ صحافی اور ادیب جناب جمنا داس اختر کے انتقال پر قومی اردو کونسل کے دفتر میں تعزیتی نشست منعقد ہوئی جس میں کونسل کے وائس چیئرمین جناب چندر بھان خیال اور ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کے علاوہ کونسل کے پورے عملے نے شرکت کی۔ جناب چندر بھان خیال نے کہا کہ جمنا داس اختر اردو کے ان بزرگ صحافیوں میں تھے جن کی صحافتی زندگی کا آغاز لاہور میں ہوا۔ تقسیم ملک کے بعد وہ دلی آگئے اور یہاں بھی ادب وصحافت کے ساتھ ان کا کل وقتی تعلق رہا۔ انھوں نے یہاں کے کئی اہم اخباروں میں نمایاں خدمات انجام دیں اور اپنی صحافتی نیز ادبی تحریروں سے سماجی اصلاح کا فریضہ انجام دیا۔ جناب چندر بھان خیال نے مزید کہا کہ مرحوم جمنا داس اختر ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار ہونے کے ساتھ ساتھ ہندو پاکستان دوستی کے بھی زبردست حامی تھے۔ انھوں نے تقسیم ہند کے المیے کے بعد بے سہارا ہندو مسلم لڑکیوں کی شادی کرا کے ان کی اجڑی ہوئی زندگیاں سنواریں۔ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے مرحوم کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جمنا داس اختر نے صحافت کی وادی میں اس وقت قدم رکھا جب ملک آزادی کی جنگ لڑ رہا تھا۔ غیرملکی حکومت کے جبر واستبداد کے خلاف آواز اٹھانا اور اہل وطن کے دلوں کو جذبات حریت سے گرمانا، ان دنوں ایک پُرخطر کام تھا۔ اس پُرخطر کام کو انھوں نے اس سلیقے سے انجام دیا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ مخمور سعیدی نے مرحوم کے ان ناولوں کا خصوصی ذکر کیا جو انھوں نے بردہ فروشی کے گھناؤنے پیشے کے خلاف لکھے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس پیشے کو زندہ رکھنے اور اسے فروغ دینے والوں کے خلاف قلمی جہاد کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے عملی جدوجہد بھی کی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس سماجی برائی کے خاتمے کے لیے کتنے مستعد تھے۔ انھوں نے طویل عمر پائی اور زندگی کے آخری دنوں تک وہ فعال رہے اس سے ان کی جواں ہمتی اور

قوت ارادی دونوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

آخر میں شرکائے نشست نے دو منٹ خاموش کھڑے رہ کر مرحوم کے تئیں عقیدت واحترام کا اظہار کیا۔

یوسف ناظم

● ممبئی۔ ''یوسف ناظم کا نہ صرف قلم بہت تیز رو تھا بلکہ وہ خود بھی ادبی و تہذیبی زندگی میں بہت فعال تھے۔ ان کے نہ رہنے سے نہ صرف ظرافت کے فن کو بہت بڑا نقصان پہنچا ہے بلکہ ممبئی کی ادبی و تہذیبی محفلیں بھی سونی ہوگئیں۔'' ان خیالات کا اظہار اردو کی معروف ادیبہ سلمیٰ صدیقی نے شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی اور شہر ممبئی کی متعدد ادبی وثقافتی انجمنوں کی طرف سے 3 جولائی 2009 کو یونیورسٹی آف ممبئی کے WIRC ہال میں منعقد کی گئی تعزیتی نشست میں کیا۔ انجمن اسلام ممبئی کے صدر جناب سمیع خطیب نے کہا کہ یوسف ناظم مرحوم کی مزاح نگاری شستہ، شگفتہ اور مہذب تھی۔ پھکڑ قسم کا مزاح ان کی تحریروں میں دور دور تک نظر نہیں آتا۔ ان کے انتقال سے اردو مزاح نگاری میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہے۔ افسانہ نگار انور قمر نے کہا کہ یوسف ناظم ایک مہذب، شائستہ اور خوش فکر مزاح نگار تھے۔ محمود ایوبی نے یوسف ناظم سے اپنی ملاقاتوں کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم ظریف شخصیت کے مالک تھے اس لیے ان کی تحریروں میں ظرافت اپنے عروج پر ہے۔ ڈاکٹر خورشید نعمانی نے کہا کہ یوسف ناظم مرحوم کا حسن سلوک ایسا تھا کہ ہر شخص سمجھتا تھا کہ وہ یوسف ناظم کا چہیتا ہے۔ مقدر حمید نے کہا کہ مرحوم میں حوصلہ افزائی کا سلیقہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ معروف شاعر عبدالاحد ساز نے کہا کہ یوسف ناظم شاعری بھی کرتے تھے لیکن بنیادی طور پر وہ نثر کے آدمی تھے اور ایک بلند پایہ مزاح نگار۔ الیاس شوقی نے کہا کہ ناظم صاحب کی محبت سب کے لیے یکساں تھی۔ وہ بڑوں سے جس خلوص سے پیش آتے تھے اتنے ہی خلوص سے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔

تعزیتی نشست کی ابتدا میں شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر صاحب علی نے بتایا کہ مرحوم شعبۂ اردو کی علمی وادبی فضا سے بہت خوش رہتے تھے۔ یوسف ناظم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے علاوہ انھوں نے اردو کے سینئر شاعر گنیش بہاری طرز کے سانحۂ ارتحال پر بھی افسوس کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر شفیع شیخ، فیاض احمد فیضی، اطہر عزیز، ڈاکٹر قاسم امام، ڈاکٹر مصطفیٰ پنجابی، یوسف شہزاد، عبید اعظم اعظمی اور ظہیر انصاری نے بھی مرحومین کے تعلق سے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ نشست انجمن ترقی اردو ہند (مہاراشٹر)، انجمن زندہ دلان ممبئی، اردو مرکز ممبئی، اردو چینل ممبئی، تکمیل پبلی کیشنز بھیونڈی، رائل ایجوکیشن سوسائٹی بورلی پنچتن اور تحریر نونوی ممبئی کے تعاون سے منعقد کی گئی۔ نشست کی نظامت کے فرائض قمر صدیقی نے انجام دیے۔

شمیمہ رضوی

● نئی دہلی۔ 20 اگست، شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں ڈاکٹر شمیمہ رضوی کے اچانک سانحہ ارتحال پر ایک تعزیتی نشست ہوئی۔ صدر شعبہ اردو ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ڈاکٹر شمیمہ رضوی کا تعلق سیاسی حوالے سے ایک خاص نظریے سے تھا۔ لیکن وہ اردو ادب کی نمائندہ لکھنے والی بھی تھیں۔ ادب اور سیاست میں توازن قائم رکھتے ہوئے انھوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے بہت اچھا کام کر رہی تھیں۔ وہ اتر پردیش اردو اکادمی کی چیئر پرسن بھی رہ چکی تھیں۔ ایک استاد کی حیثیت سے بھی شعبۂ اردو میں بہت مقبول تھیں۔ ان کے اظہار کے ساتھ خیالات مرحومہ کے حق میں دعائے مغفرت کی گئی۔ اس نشست میں ڈاکٹر جاوید، ڈاکٹر ابوبکر، ڈاکٹر ارجمند آرا، ڈاکٹر زاہد الحق، ڈاکٹر تنویر حسین، ڈاکٹر ارشاد نیازی، ڈاکٹر احمد امتیاز، ڈاکٹر علاء الدین خاں وغیرہ کے علاوہ طلبہ وطالبات نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

❑❑❑

رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی

مرتب: ڈاکٹر وشوامترا پادھیائے/ مترجم: احسان احمد صدیقی

مادرِ وطن کی آزادی کے لیے اپنی جان کی قربانی پیش کرنے والوں میں مشہور انقلابی رام پرشاد بسمل سرِ فہرست ہیں۔ یہ آپ بیتی انھوں نے گورکھپور جیل میں اپنی پھانسی سے دو دن پہلے مکمل کی تھی۔ جدوجہد آزادی کے اس دور کی حقیقی تصویر کشی کے سبب یہ آپ بیتی دستاویزی اہمیت کی حامل ہے۔

صفحات: 109، قیمت-/33 روپے

تبصرہ وتعارف

یادو بود غالب

مصنف: پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

صفحات: 148، قیمت: -/53

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی

مبصر: عبدالرشید اعظمی، 303 کاویری ہوسٹل، جے این یو، نئی دہلی

یہ تصنیف خواجہ احمد فاروقی کے نو تحقیقی مضامین پر مبنی ہے جو غالب کی زندگی کے بہت سارے معاملات و مسائل پر روشنی ڈالتی ہے۔ پہلا مضمون ''غالب کی عظمت'' کے عنوان سے ہے جو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں خواجہ احمد فاروقی نے عہد غالب کے ہندوستان کا سیاسی منظرنامہ مختصراً پیش کیا ہے۔ جس میں غالب نے اپنے مزاج اور جذبات سے گریز کرکے مصلحت کوشی سے کام لیا ہے۔ خواجہ صاحب نے بدلتے ہوئے حالات میں غالب کی جدت پسند طبیعت کے مطابق شعروادب کے متعلق ان کا ایک قول نقل کیا ہے ''ہر پرانی لکیر صراط مستقیم نہیں، اور اگلے جو کچھ کہہ گئے ہیں وہ پوری طرح سند نہیں'' خواجہ صاحب نے مضمون میں غالب کے کلام کی روشنی میں ان کی عظمت، ایرانی ہندی نزاع، کلکتہ میں قتیل کے حلقہ بگوشوں سے معرکہ آرائی نیز دوسروں پہ اپنے تفوق وعظمت کے دعوؤں کا ذکر کیا ہے اور ایران توران کے باکمال فضلا کی فہرست میں غالب کو ایک مقام دیا ہے۔ دوسرا مضمون ''غالب اور بے صبر'' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون میں خواجہ احمد فاروقی نے غالب کے ایک شاگرد منشی بال مکند بے صبر کی تاریخ پیدائش اور سال وفات کی تحقیق پیش کی ہے جس میں اب تک کافی اختلاف تھا۔ ان کا شجرۂ نسب تحریر کیا ہے اور کلام بھی درج کیا ہے۔ گیارہ صفحات کے مضمون میں کم وبیش نو صفحات میں بے صبر کا کلام نقل کیا گیا ہے۔

تیسرا مضمون ''غالب اور آزردہ'' ہے۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ، غالب کے ہم عصر تھے۔ خواجہ صاحب نے یہ تحقیق پیش کی ہے کہ غالب ان کے علم وفضل کا اعتراف کرتے تھے۔ دلیل میں ابوالکلام آزاد اور حالی کے اقوال مع فارسی کلام آزردہ تحریر کیے ہیں۔

چوتھا مضمون ''غالب کی شخصیت اور شاعری میں ترکی ایرانی عناصر'' ہے۔ یہ مضمون قدرے طویل ہے۔ یعنی 19 صفحات تحریر کیے گئے ہیں۔ اس میں خواجہ صاحب نے ہندوستان اور ترکی و ایران کے محل وقوع اور آب وہوا کی تفصیل بیان کی ہے اور ترکی و ایران کے ہندوستان پر اثرات پر روشنی ڈالی ہے۔ بعدازاں غالب کے آباواجداد اور ان کے وطن کی تفصیل بیان کی ہے نیز ان تمام کے اثرات، غالب، ان کی شخصیت، ان کے کلام پر کیا ہوئے ان سب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پانچواں مضمون ''غالب کا مقدمۂ پنشن'' ہے۔ یہ مضمون پندرہ صفحات میں مکمل ہوا ہے۔ اس مضمون میں خواجہ صاحب نے غالب کے مقدمے کی تفصیل ان کی درخواستوں کی روشنی میں پیش کی ہے۔ چھٹا مضمون: ''غالب کے چند غیر مطبوعہ فارسی رقعات حضرت غمگین کے نام'' ہے۔ یہ مضمون دس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں غالب کے رقعات کی روشنی میں دونوں شخصیات کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ نیز غمگین کے حالات زندگی کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔

ساتواں مضمون ''غالب کا سکۂ شعر'' ہے۔ اس مضمون میں خواجہ احمد فاروقی نے سکۂ شعر کی حکایت کی تفصیل لکھی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ بہادر شاہ کی تخت نشینی کے وقت 1837یا1838 میں مذکورہ سکۂ شعر ذوق نے کہا تھا۔ یہ گفتگو سات صفحات میں مکمل ہوتی ہے۔

آٹھواں مضمون ''معرکۂ غالب و حامیانِ قتیل ایرانی، ہندی نزاع کی روشنی میں'' ہے۔ یہ مضمون قدرے طویل ہے۔ موضوع سے تو ایسا لگتا ہے کہ پوری بحث غالب اور قتیل کے حامیوں کے معرکے پر ہے لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ خواجہ احمد فاروقی نے اس وقت کے بڑے بڑے باکمالوں کے معرکوں پر روشنی ڈالی ہے جیسے فیضی، عرفی، ابوالفضل، ظہوری، قدسی، زلالی، حزیں، خان آرزو، امام بخش صہبائی اور مرزا علی لطف ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی نے حزیں اور خان آرزو کے معرکے پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد غالب اور ماہیانِ قتیل نیز کلکتہ کی ادبی شاعرانہ فضا پر گفتگو کی ہے۔ غالب سے متعلق ایرانی ہندی نزاع حامیان قتیل سے دس صفحات میں مکمل ہوتی ہے۔ اس بحث میں خواجہ احمد فاروقی نے غالب کی ترش مزاجی اور زود بیانی مع مثال پیش کی ہے اور کلکتہ میں غالب کے ایرانیوں سے مراسم بیان کیے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کتاب غالب شناسی کے لیے معاون ہے۔ خاص طور پر تحقیق کے طلبہ کے لیے کارآمد ہے۔

تبصرات ماجدی

مرتب: عبدالعلیم قدوائی

صفحات: 471، قیمت: -/277

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی

مبصر: مرتضٰی علی اطہر، 3520/2، دیپ نواس، نیر کا، نئی دہلی-67

''تبصرات ماجدی'' مشہور عالم، صاحب طرز انشا پرداز اور صحافی مرحوم مولانا عبدالماجد دریابادی کے ان ادبی تبصروں کا انتخاب ہے جو ان کے ہفتہ وار اخباروں ''صدق'' اور ''صدق جدید'' میں شائع ہوئے۔ کتاب کے مرتب جناب عبدالعلیم قدوائی نے بڑی محنت اور خوبی کے ساتھ اس کام کو انجام دیا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں ''فہرست تبصرات ماجدی'' کے تحت تبصرہ شدہ کتابوں کے نام، ان کے مصنفین/ مرتبین کے نام، مذکورہ دونوں پرچوں میں سے جس پرچے میں تبصرہ شائع ہوئے اس کا حوالہ، شمارہ نمبر، جلد نمبر اور تاریخ اشاعت کی فہرست، یہ سب تاریخی ترتیب کے ساتھ دیا گیا ہے۔ مرتب نے فہرست کی ترتیب میں جدید اصول ترتیب کو پیش نظر رکھا ہے جس سے کتاب کی وقعت میں اضافہ ہوا ہے۔ فہرست میں تبصرہ شدہ کتابوں کو متعلقہ اصناف ادب کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ افسانہ، اقبالیات، تاریخ ادب، تذکرہ، تنقید، حکایت، خاکے، خطوط، داستان، ڈرامہ، روزنامچہ، سفرنامہ، سماجیات، سوانح، شاعری، طنز ومزاح، لغت، مجموعۂ مضامین اور ناول کے تحت کل دو سو چار تبصروں کو شامل کیا گیا ہے۔ ایک تبصرہ متفرق کے زمرے میں شامل ہے، اس طرح تبصروں کی کل تعداد 205 ہے لیکن کتاب کے دیباچے میں مرتب نے تبصروں کی تعداد 209 بتائی ہے جو کہ صحیح نہیں ہے۔ کتاب کے صفحہ XXII پر وہ لکھتے ہیں:

''اس کتاب میں ان کے (مولانا عبدالماجد دریابادی کے) قلم سے لکھے ہوئے 209 تبصرہ شامل ہیں جو زیادہ تر انھوں نے اپنے ہفتہ وار اخبارات ''صدق'' اور ''صدق جدید'' میں شائع کیے۔ صرف دو مفصل تبصرے جن کو مقالات بھی کہا جاسکتا ہے ''مرزا رسوا کے قصے کچھ ادھر سے کچھ اُدھر سے'' اور ''پریم چند'' کہیں اور شائع ہوئے ہیں۔ مگر موضوع کی دلچسپی اور اہمیت کے پیش نظر ان کو کتاب میں شامل کرلیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دو ریڈیو نشریوں ''غالب کا فلسفہ اور دلم در عاشقی آوارہ شد'' کو بھی ان کی ادبی دلآویزی کی بنا پر کتاب میں ضمیموں کی شکل میں شامل کیا گیا ہے۔

لیکن کتاب کی فہرست میں 205 تبصروں کا نمبر شمار درج ہے اور کتاب کے اندر بھی کل 205 تبصرے ہی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ پوری کتاب میں کہیں کوئی ضمیمہ بھی نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرتب نے جن چار مضامین کا خصوصی ذکر کیا ہے وہ نامعلوم وجوہ کی بنا پر کتاب میں جگہ نہیں پاسکے ہیں۔ قوی امکان ہے کہ یہ غلطی بعد میں کسی وجہ سے در آئی ہو اور ترتیبی مراحل سے اس کا تعلق نہ ہو۔ پھر بھی یہ ایک کمی ہے جو کھٹکتی ہے۔ آئندہ ایڈیشن میں یا تو مذکورہ تبصروں کو شامل کیا جانا چاہیے یا مندرجہ بالا اقتباس کی تصحیح کردینا چاہیے۔

کتاب میں شامل تمام تبصرے 1935 سے 1972 تک کی مدت میں ''صدق'' اور ''صدق جدید'' میں شائع ہوئے سوائے ایک تبصرہ کے جو 1930 میں ''الناظر'' میں شائع ہوا تھا۔ یہ تبصرہ ظفر عمر صاحب کے ناول ''مرزا بلگرامی۔ لال کھوڑ'' پر ہے۔ دیباچے میں اس کی وضاحت بھی ہوتی تو بہتر تھا۔ مرتب نے کتاب کے دیباچے میں مولانا کی شخصیت اور ان کے علمی اور ادبی کارناموں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مولانا موصوف کثیر الجہت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی علمی وادبی خدمات بھی متنوع ہیں۔ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے تعلق سے دیباچے میں مختصر مگر صائب معلومات فراہم کردی گئی ہے۔ عبدالماجد دریابادی ایک منفرد اور مخصوص طرز تحریر کے مالک تھے۔ ان کی زبان صاف، شستہ اور لکھنوی روزمرّہ کا خوبصورت نمونہ ہے۔ وہ ایک مصلح بھی تھے اور علامہ شبلی کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر بھی۔ مشرقی ثقافت اور مذہبی اقدار کی پاسداری ان کی طبیعت کے خاص اوصاف تھے۔ ان کی تنقید اور تبصروں میں بھی ان کی شخصیت اور مزاج کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مرتب نے ان کی تنقیدی بصیرت پر بھی منصفانہ اظہار خیال کیا ہے۔ مولانا کی ادبی حیثیت اور ان کے طرز انشا کی تفہیم میں یہ کتاب بہت مفید ہے۔ نیز مولانا کے نظریۂ شعروادب کا سراغ بھی ان تبصروں سے ملتا ہے۔

کتاب کے آخر میں ''اشاریہ'' دیا گیا ہے جس میں تبصرہ شدہ کتابوں کے نام، ان کے مصنفین کے نام اور صفحہ نمبر حروف تہجی کے لحاظ سے درج کیے گئے ہیں تاکہ قارئین کو حوالہ ڈھونڈنے میں پریشانی نہ ہو۔ مجموعی طور پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی یہ کتاب ادبی حلقوں میں قبولیت اور پذیرائی حاصل کرنے کی مستحق ہے۔

اردو زبان کی تدریس

مصنف: معین الدین

صفحات: 147، قیمت: -/43 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی

مبصر: عبدالسمیع، 102 کاویری ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی-110067

اردو زبان کی تدریس کے موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں جن سے اردو زبان کی تدریس کے مسائل کا علم ہوتا ہے۔ کسی بھی زبان کی تدریس کا مسئلہ وقت گزرنے کے ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ لیکن کچھ مسائل بنیادی نوعیت کے ہوتے ہیں جو تبدیل نہیں ہوتے۔ اردو زبان کی تدریس کے مسائل کا بنیادی تعلق جن چیزوں سے ہے معین الدین نے انھیں مختلف ابواب اور عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ اس کتاب کے پندرہ ابواب ہیں اور ان کے چند ذیلی عنوانات بھی ہیں۔ ان ابواب اور عنوانات کو دیکھنے اور پڑھنے کے بعد اردو

زبان کی آوازوں، علامتوں، اشاروں کے حوالے سے معین الدین کی گہری اور معروضی نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

پروفیسر محمد حسن کی کتاب ''ادبیات شناسی'' 1985 میں منظر عام پر آئی تھی وہ کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

'' زیرنظر تصنیف اردو زبان کے اساتذہ کی نذر ہے اردو پڑھانے کی مختلف سطحیں ہیں اور مختلف مرحلے ہیں اس کتاب کا موضوع بی.اے. اور ایم.اے. کی سطح پر اردو ادب کی تدریس کے مقاصد اور طریقۂ کار ہے۔''

جیسا کہ محمد حسن نے خود ہی لکھا ہے کہ ان کی کتاب میں اردو ادب کی تدریس کے مقاصد اور طریقۂ کار سے بحث کی گئی ہے یعنی زبان کی تدریس کا کام ہم اس کتاب سے نہیں لے سکتے۔ معین الدین نے یہ کتاب لکھ کر اس کمی کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اس کی افادیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اب تک اس کتاب کے چھے اڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں۔

کتاب کے عنوانات کچھ اس طرح ہیں: زبان، تدریس اردو کے مقاصد، تدریس نثر، تدریس نظم، تدریس غزل، تدریس انشا، گرامر کی تدریس، مطالعہ، نصاب، درسی کتب، بچوں کا ادب، تدریس اردو (غیر اردو داں کے لیے)، اندازۂ قدر، امدادی سامان اور دیگر وسائل، اشارات سبق۔

ان ابواب کے ذیلی عنوانات معین الدین کے تجزیاتی اندازنظر کی غمازی کرتے ہیں اگر یہ ذیلی عنوانات قائم نہ کیے جاتے تو شاید یہ کتاب اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہوتی۔ زبان کی تدریس میں ایک منزل ایسی بھی آتی ہے جب ادب سے اسے وابستہ کرکے دیکھنا ناگزیر ہوجاتا ہے۔ گرامر کے مسائل کو جاننے سمجھنے کے بعد ادبی ہیئت کی طرف بھی مدرس کی نظر جاتی ہے اور ایسا ہونا فطری ہے۔ معین الدین نے تدریس نظم اور تدریس غزل نیز بچوں کا ادب جیسے عنوانات قائم کیے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ تلفظ، اسلوب صرف ونحو اور اس قسم کے دیگر مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے بھی کسی فن پارے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

تدریس نظم کے باب میں معین الدین نے اہم نکات کی طرف اشارے کیے ہیں جیسے:

تدریس کا مقصد یہ نہیں کہ نظم میں استعمال شدہ مشکل یا نامانوس الفاظ و تراکیب کے معنی اور مطلب سمجھائے جائیں بلکہ اس سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیا جائے۔ اس لیے نظم پڑھاتے وقت اس بات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ طالب علم نظم کی تازگی اور شگفتگی یعنی نظم کے جمالیاتی حسن کو سراہ سکے، جمالیاتی قدروں کا احساس پیدا کرسکے اور تفہیم کے ذریعے ادبی حسن شناسی کی صلاحیت پیدا کرسکے۔ (اردو زبان کی تدریس، ص-38)

اس طرح تدریس غزل کے باب میں معین الدین لکھتے ہیں:

غزل کی تدریس نظم کی تدریس کے مقابلے میں زیادہ مشکل ہے اس عمل میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ استاد غزل کی ساخت، اسلوب اور عہد بعہد ترقی سے واقف ہو، اسے ہر دور کی نمائندہ غزلوں کا شعور ہو اور غزل کا ایک رچا ہوا شوق رکھتا ہو، اسی صورت میں وہ اپنے شاگردوں کو غزل سے لطف اندوز کرا سکتا ہے۔'' (اردو زبان کی تدریس، ص-44)

تدریس نظم و نثر کے تمام مراحل کو مثالوں کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ مدرسین کو کوئی پریشانی نہ ہو اور وہ افہام وتفہیم کے عمل سے انصاف کرسکیں۔

زیرنظر کتاب میں گرامر کی تدریس پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے اور اس کے دونوں طریقوں (استخراجی، استقرائی) پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ علم ہجا اور صرف ونحو کی تدریس اور بچوں میں اس کی سمجھ پیدا کرنے کے مختلف طریقے بیان کیے گئے ہیں۔

معین الدین نے مطالعے کی اہمیت اور اس کے اقسام سے بہت اچھی بحث کی ہے بلند خوانی خاموش مطالعہ وغیرہ کے اصول وضوابط درج کیے گئے ہیں۔

بچوں کی تعلیم کا سب سے اہم ذریعہ درسی کتابیں ہیں۔ درسی کتاب کا تعین بہت ہی پیچیدہ اور حساس مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کو مصنف نے عمر اور کلاس کے لحاظ سے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ابتدائی جماعت کے طلبہ کی نفسیات کیسی ہوتی ہے اور ان کی دلچسپی کا میدان کیا ہے۔ پھر ثانوی اور درمیانی سطح پر کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچوں کی کتابوں کے مضامین کیسے ہوں، اس کا تعلق مختلف درجات سے ہوتا ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ کتاب میں مواد کیسا رکھا جائے جس سے بچوں میں دلچسپی پیدا ہو۔ مصنف نے بچوں کے ادب سے متعلق جو رائے دی ہے وہ بہت توجہ طلب ہے۔

''اردو زبان کی تدریس'' کا ایک اہم حوالہ'' غیر اردو داں طبقے میں اردو کی تدریس'' ہے۔ اس سلسلے میں معین الدین کی باتیں صرف نظری معلوم نہیں ہوتیں بلکہ مصنف نے عملی طور پر اردو کو غیر اردو داں طبقے کے لیے آسان بنا کر پیش کیا ہے اور اساتذہ کو وہ باریکیاں بتائی ہیں جن سے غیر اردو داں طبقے کو سہولت کے ساتھ اردو سکھائی جاسکتی ہے۔

اردو زبان و ادب کی تدریس میں امدادی ساز وسامان کس طرح استعمال کیے جاسکتے ہیں اور اس سے تفہیم زبان وادب میں کتنی مدد مل سکتی ہے اس ضمن میں مصنف نے ''امدادی سامان اور دیگر وسائل'' کا عنوان قائم کیا ہے۔ جس میں کاغذی، الیکٹرونک امدادی ساز وسامان کے استعمال کے طریقے بتائے گئے ہیں۔

بچوں کی تعلیم وتربیت کا اندازہ کس طرح کیا جاسکتا ہے اس کے لیے

مصنف نے ''اندازۂ قدر'' کا ایک عنوان قائم کیا ہے جس میں تدریسی مقاصد، آموزشی تجربات اور مختلف اقسام کے سوالات جیسے مماثل مدات، متبادل، مدات، انتخاب مدات اور تکمیل مدات کے طریقے درج کیے گئے ہیں ساتھ ہی چند سوالات بطور نمونہ اساتذہ کے لیے پیش کیے گئے ہیں۔

مجموعی اعتبار سے یہ کتاب اردو زبان کی تدریس کے سیاق میں ایک اہم حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔

صبح مشرق کی اذاں

شاعر: چندر بھان خیال

صفحات: 163، سائز ڈیمائی، قیمت: -/150

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی-6

مبصر: مخمور سعیدی، 3/141C-ڈی، کرشنا کنج ایکسٹینشن، لکشمی نگر، دہلی-92

چندر بھان خیال اردو کے معروف و ممتاز شاعروں میں ہیں۔ وہ مدھیہ پردیش کے ضلع ہوشنگ آباد کے ایک قصبے باعی میں پیدا ہوئے جہاں اردو تعلیم کا کوئی نظم نہیں تھا اور ان کے بزرگوں میں بھی اردو زبان و ادب سے کسی کو دلچسپی نہ تھی۔ ان کا ذریعۂ تعلیم اسکول سے کالج تک ہندی رہی اور بطور مضمون انھوں نے سنسکرت اور انگریزی پڑھی لیکن کوئی اندرونی لگن تھی جو انھیں اردو کی طرف لے آئی اور وہ اردو ہی کے ہو کر رہ گئے۔ جیسا کہ انھوں نے اس کتاب کے آغاز میں ''عرضِ ماضی'' کے زیرِ عنوان لکھا ہے اردو سے ان کی دلچسپی دیوناگری لپی میں غالب، فیض، فراق، جوش، ساحر لدھیانوی اور کچھ دوسرے شاعروں کا کلام اور منٹو، بیدی، کرشن چندر اور عصمت کی کہانیاں پڑھ کر پیدا ہوئی اور پھر انھیں اردو کے شاعروں اور ادیبوں کو براہِ راست اردو رسم الخط میں پڑھنے کا خیال آیا۔ اس سلسلے میں ایک کتاب ''ہندی اردو ٹیچر'' نے ان کی مدد کی۔ اس اثنا میں وہ خود بھی شعر کہنے لگے تھے۔

چندر بھان خیال 1966 میں دہلی آگئے۔ یہاں کچھ مدت بعد ان کی ملاقات پنڈت رام کرشن مضطر سے ہوئی جو اردو روزنامہ ''ملاپ'' کے ادبی حصے کے انچارج تھے۔ مضطر صاحب نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور شاعری کے فن میں انھیں اپنا شاگرد بنا لینا بھی قبول کرلیا۔ یہ کتاب انھوں نے مضطر صاحب کے نام ہی معنون کی ہے۔

دہلی میں خیال صاحب دو اردو روزناموں ''سویرا'' اور ''تیج'' کے سب ایڈیٹر اور 1983 سے 2006 تک کانگریس کے ترجمان روزنامہ ''قومی آواز'' کے سینیئر رپورٹر رہے۔ ان دنوں قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین ہیں۔

زیرِ نظر کتاب کے علاوہ خیال صاحب کی اب تک درج ذیل کتابیں شائع ہوئی ہیں: شعلوں کا شجر، نظموں کا مجموعہ، 1979 گم شدہ آدمی کا انتظار، نظموں کا مجموعہ، 1997 کمار پاشی: شخصیت اور شاعری، 1997 سلگتی سوچ کے سائے، نظموں کا مجموعہ، دیوناگری لپی میں، 2002، لولاک، پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کی سیرت مبارک پر مبنی طویل نظم 2002۔

''صبح مشرق کی اذاں'' خیال صاحب کا تازہ ترین شعری مجموعہ ہے جس میں نظموں کے علاوہ غزلیں بھی خاصی تعداد میں شامل ہیں۔ خیال صاحب کو نظم گوئی سے زیادہ شغف رہا ہے لیکن وہ ایک کامیاب غزل گو بھی ہیں اور نظموں ہی کی طرح ان کی غزلیں بھی معنیاتی سطح پر بھی اور لفظیاتی سطح پر بھی انفرادیت کی حامل ہیں۔ یہ انفرادیت دین ہے ان کے اس طرزِ احساس کی جو ان کی شاعری میں اس طرح رچ بس گیا ہے جس طرح پھول میں خوشبو۔ وہ ایک حساس انسان کی طرح زندگی اپنے نجی احساسات کی سطح پر جیتے ہیں اور آس پاس کے مناظر کو ایک خاص زاویۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ انھوں نے خارجی موضوعات پر بھی نظمیں کہی ہیں لیکن موضوعات وہی ہیں جنھوں نے ان میں داخلی ہلچل یا تحرک پیدا کیا ہے۔ یہ موضوعات تاریخی بھی ہیں، سیاسی اور سماجی بھی، بعض کا تعلق ایسی شخصیات سے ہے جن سے شاعر ذہنی یا جذباتی طور پر متاثر ہوا ہے اور بعض کا تعلق ان معاملات سے ہے جنھیں ہم نجی کہہ سکتے ہیں۔ اس ذیل میں عشقیہ معاملات بھی آسکتے تھے لیکن ان کا گزر خیال صاحب کے ہاں کم کم ہی ہوا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جہاں تک عشقیہ جذبات و احساسات کا تعلق ہے، ان کا مرکز و محور خیال کے لیے ایک ہی ذات ہے جسے ہم خلاصۂ کائنات بھی کہہ سکتے ہیں اور وہ ہے پیغمبر اسلام کی ذات بابرکات جس کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے انھوں نے ''لولاک'' جیسی شاہکار نظم تخلیق کی۔ ''صبح مشرق کی اذاں'' میں متعدد نعتوں کی شمولیت بھی یہی گواہی دیتی ہے۔

خیال صاحب کی نظموں کے اقتباسات کی گنجائش تو اس مختصر تبصرے میں نہیں نکل سکتی، ان کی غزلوں کے چند شعر ملاحظہ کریں جن سے ان کے مخصوص لب و لہجہ کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے:

میں جہاں جاؤں، مرے ساتھ چلے سناٹا
میری آنکھوں میں لگاتار جلے سناٹا

انھیں مندر بنانا ہے، انھیں مسجد بچانا ہے
کوئی سنتا نہیں ان کی جنھیں اک گھر بنانا ہے

آئینہ سورج کا کب اس درجہ گرد آلود تھا
چاند کی محفل کبھی اتنی حزیں پہلے نہ تھی

غاروں میں کوہ و دشت کے، ڈھونڈا کیے پناہ
تہذیب کی فضاؤں سے جب تنگ آئے ہم

تازہ کار شاعری کے قدردانوں سے اس مجموعے کے مطالعے کی پرزور سفارش کی جاسکتی ہے۔

سرمۂ اعتبار

شاعر: رئیس نعمانی

صفحات: 186، قیمت: درج نہیں

ناشر: مرکز تحقیقات فارسی، رایزنی فرہنگی، سفارت خانہ جمہوری اسلامی ایران، تلک مارگ، نئی دہلی

مبصر: ابوالکلام قاسمی، شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی

ڈاکٹر رئیس نعمانی فارسی اور اردو، دونوں زبانوں میں قدرتِ کلام رکھتے ہیں۔ اردو، فارسی اور عربی پر عبور کے باعث ان کے یہاں اظہار و ابلاغ کے مسائل کم سے کم پیدا ہوتے ہیں۔ زبان اور اسلوب دونوں شفاف اور ذخیرۂ الفاظ وسیع نظر آتا ہے۔ فارسی زبان میں یوں تو رئیس نعمانی نے نئی شعری ہیئتوں میں شعر کہنے کا تجربہ شاید نہیں کیا، البتہ اردو میں بہت پہلے ان کی بعض آزاد اور معریٰ نظمیں ہندو پاک کے مستند رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ پابند ہیئتوں کے برخلاف نئی شعری ہیئتیں انھیں راس نہیں آئیں اور وہ پھر لوٹ کر پرانی ہیئتوں کی طرف واپس آ گئے۔

''سرمۂ اعتبار'' کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک کہنہ مشق اور کلاسیکی مزاج کے حامل شاعر کا ایسا فارسی مجموعۂ کلام ہے جس کو کلاسیکی مزاج رکھنے والوں کے درمیان ان کے ذوق کی تسکین کے باعث اور غیر کلاسیکی مزاج کے قاری کے لیے کلاسیکی آداب سے واقفیت کے نقطۂ نظر سے خاصی اہمیت کا حامل قرار دیا جاسکتا ہے۔ فارسی زبان میں گذشتہ نصف صدی میں نئے رجحانات اور جدید طرزِ احساس کی شاعری بھی ہوئی ہے مگر اس زبان کا مزاج ہنوز کلاسیکی ہے۔ اس لیے کہ اس کی لفظیات، تراکیب اور استعارے بالعموم کلاسیکی رکھ رکھاؤ اور روایتی تصورِ کائنات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ان معروضات سے یہ نہیں سمجھا جانا چاہیے کہ زیرِ تبصرہ مجموعے میں جدید زندگی اور نئی معاشرتی صورتِ حال کی عکاسی کرنے والے اشعار نہیں ملتے۔ رئیس نعمانی چوں کہ نہایت حساس اور شدید ردِ عمل رکھنے والے شاعر ہیں، اس لیے معاصر زندگی کی افتاد کی جھلکیاں جگہ جگہ بکھری نظر آتی ہیں۔ وہ جب دین اور دنیا کے مثالی تصور پر قائم رہنے کی کوشش کرتے ہیں تو دنیاداروں سے کہیں زیادہ دین دار حضرات کی دنیاداری انھیں کوفت اور اذیت میں مبتلا کر دیتی ہے۔

اہلِ دنیا را چہ گویم من، کہ در بازارِ دیں
ہیچ کس، غیر از خریدار و فروشندہ نبود

ان کے لیے دنیا کا تجربہ بالعموم کوئی خوش گوار تجربہ نہیں بن پاتا۔

ہرگز حلاوتی ز جہاں کامِ ما نہ یافت
ہر تلخی کہ بود چشیدیم عمرہا

اس تجربے نے شاعر کو اپنی عمر کی رائیگانی اور اپنے کسبِ کمال کی ناقدردانی کا ایسا احساس دلا رکھا ہے کہ ان کا اپنا بنایا ہوا ہر نقشِ کمال، نقش برآب اور رشتۂ حیات کی بافت تارِ عنکبوت بن کر رہ جاتی ہے:

اندیشۂ درستیِ عالم کہ کردہ ایم
نقشی بہ روئے آب کشیدیم عمرہا
ناپائدار بود ہر آن رشتہ کز حیات
چوں تارِ عنکبوت تنیدیم عمرہا

شاید یہی وجہ ہے کہ شاعر کو سارے انسان خوابِ غفلت میں پڑے نظر آتے ہیں اور اس صورتِ حال میں کسی ہوش مند انسان کی تلاش و جستجو بھی ان کے لیے تضیعِ اوقات بن کر رہ جاتا ہے۔

فارغ از اندیشۂ امروز و آئندہ نہ بود
زندگی می کرد، اماں ہیچ کس زندہ نہ بود
اہلِ بینش را غلط جستم بہ شہرِ غافلاں
بود آں کس نیز، در خوابے کہ خوابندہ نہ بود

متذکرہ اشعار میں جس تلخی، مایوسی اور زندگی کی لایعنیت سے ہمارا سابقہ پڑتا ہے، اس سے یہ اندازہ نہیں لگانا چاہیے کہ زندگی کے مثبت پہلوؤں پر ان کی نگاہ نہیں ہے، یا زندگی کی اعلیٰ اقدار سے وہ یکسر مایوس ہیں۔ انھوں نے کلاسیکی غزل کے توسط سے جس تصورِ کائنات سے وابستگی حاصل کی ہے اور خلوص اور محبت کے جذبات کو جس طرح اپنے دل کی بھٹی میں پکا کر کندن کیا ہے اس کا اظہار جگہ جگہ ملتا ہے۔ وہ حسن کی سحر انگیزی کے بھی قائل ہیں اور عشق کی ازخودرفتگی کا بھی شعور رکھتے ہیں:

طالبانِ حسن را با وصل و با ہجراں چہ کار
بس بود بہرِ دلِ ما سحرِ پیمانِ شما
از باغِ آرزوئے وصالش ہمیں بس است
گل ہائے انتظار کہ چیدیم عمرہا
خزاں خوش است نہ ہنگامۂ بہار خوش است
بہ موسمی کہ رسد یار در کنار، خوش است

ان اشعار میں معاملہ آرزوئے وصال کا اور گل ہائے انتظار کا ہو یا پھر چشمہ موسم ہم آغوشی کا محبوب کا یہ تمام لفظیات، الفاظ کی سطح پر اسی طرح شفاف معنویت رکھتے ہیں جس طرح استعاروں کی حیثیت سے اکثر الفاظ معنی آفرینی کے نئے دروازے وا کردیتے ہیں۔ اس نوع کے فنی اسرار و رموز رئیس نعمانی

نے کلاسیکی فارسی شاعری میں ڈوب کر اور غواصی کرکے سیکھے ہیں۔

علامہ اقبال نے رسمی مذہبیت پر ایک جگہ واعظ اور فرزندِ واعظ کی بے روح مذہبیت کے حوالے سے اس طرح طنز کیا تھا:

واعظ اندر مسجد و فرزند او در مدرسہ
او بہ پیری کودکی، اس پیر در عہد شباب

رئیس نعمانی نے اس مضمون کو اپنی ذات اور عمر کی رایگانی کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور کم و بیش تو اردو کی حد تک ان کا زاویۂ نظر علامہ کے قریب ہوگیا ہے۔

چہ می پرسی ز من، تاثیرِ آبِ ارغوانی را
بہ طفلی ہر کہ گشتہ پیر، کہ داند جوانی را

مگر اسی غزل میں انھوں نے ایک ایسا دانش مندانہ شعر بھی کہا ہے جو اپنی بصیرت افروزی کے باعث سالہا سال کے تجربے کا نچوڑ کہا جاسکتا ہے:

مثالِ گل درایں گلشن نخواہی گر تو پژمردن
مکن ہرگز نمایاں غنچہ ساں زخمِ نہانی را

رئیس نعمانی کا یہ مجموعۂ کلام ہندوستان میں فارسی شاعری کا ایک درخشاں باب وا کرتا ہے اور اس روایت کا ازالہ کرتا ہے کہ ہندوستان کے فارسی شاعروں کو ماسوا امیر خسرو اور بیدل جیسے عظیم الشان شعرا کو، ایران میں برائے نام ہی اعتبار حاصل ہوا۔ چنانچہ اس ضمن میں یہ اطلاع ایک بشارت بن جاتی ہے کہ چند ماہ کے اندر اندر ''سرمۂ اعتبار'' کا ایک ایڈیشن پچھلے دنوں ایران سے بھی شائع ہوگیا ہے۔

اردو کا پہلا صاحب دیوان عرب شاعر، ڈاکٹر زبیر فاروق

ترتیب: جاوید انور

صفحات: 127، قیمت: -/200

ناشر: تحریک ادب وارانسی

جاوید انور کی ترتیب دی ہوئی کتاب ''اردو کا پہلا صاحب دیوان عرب شاعر، ڈاکٹر زبیر فاروق'' دیکھ کر خیال آیا کہ ایک عرب اردو تو بول سکتا ہے لیکن کیا وہ اردو شعر و ادب کی زلفیں بھی سنوار سکتا ہے۔ ڈاکٹر زبیر فاروق کی شاعری ان کے مشاہدات و تجربات کی آئینہ دار ہے۔ ان کی شاعری پر عربی کے اثرات بھی محسوس نہیں ہوتے اور ان کا کلام پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت، ماحول اور اردو زبان و ادب سے انھیں بے حد لگاؤ ہے، ان کی شاعری یہ ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اردو کے اندر عالمی زبان ہونے کی قوت و کشش موجود ہے۔

ترجمے کا فن اور ترسیل کے طریقے

مصنف: ڈاکٹر ایم حسو (حسن)

صفحات: 278، قیمت: -/140

ناشر: عادل پبلشرز، کورٹ روڈ تلیچری، کنور، کیرلہ

یہ ترجمے کے فن اور ترسیل کے طریقے پر ایک عمدہ پیشکش ہے۔ مصنف نے ترجمے کی ضرورت، ترجمے کی اقسام اور ترجمے کے مسائل پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ یہ کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ نثری، منظوم، آزاد، لفظی اور تخلیقی تراجم پر الگ الگ گفتگو کی گئی ہے۔ کسی عبارت کے اردو سے انگریزی یا انگریزی سے اردو میں منتقل کیے جانے کے عمل میں ہونے والی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے تراجم کے نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں۔ مصنف نے انگریزی کے بعض اقتباسات کے، متعدد مترجمین کے تراجم کا موازنہ کرکے ان کے حسن و قبح کی نشاندہی بھی کی ہے۔ مثلاً ارسطو کی Poetics (بوطیقا یا شعریات) کا ایک اقتباس نقل کرکے اس کے چار مترجمین عزیز احمد، آل احمد سرور، جمیل جالبی اور بشیر احمد کے تراجم پیش کیے ہیں اور بشیر احمد کے ترجمے کو بہتر قرار دیا ہے۔ ایک طرح سے یہ کتاب مترجمین کے لیے گائڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔

معصوم بجوکا

مصنف: وکیل نجیب

صفحات: 208، قیمت: -/100

ناشر: نورانی آفسیٹ پرنس، مالیگاؤں

بجوکا علامت ہے پاسبان، نگہبان اور محافظ کی۔ یہ انسانوں کی ضرورت ہے اس لیے صدیوں سے ان کے درمیان موجود ہے۔ اس کی افادیت مسلّم ہے لیکن ادب کا حصہ بننے میں اسے کافی مدت لگی۔ سریندر پرکاش کے افسانے ''بجوکا'' کو اس ضمن میں اولیت حاصل ہے۔ جس نے افسانہ نگاروں کو نئے نئے ڈھنگ سے سوچنے کا موقع فراہم کیا۔ سلام بن رزّاق، قمر علی، پرویز شہریار نے ''بجوکا'' کے موضوع پر افسانے لکھے۔ اب وکیل نجیب نے ''معصوم بجوکا'' لکھ کر بچوں کے روپ میں ایک اہم اضافہ کیا ہے۔ اگرچہ یہ ناول بچوں کے لیے لکھا گیا ہے لیکن موضوع کے اعتبار سے سماج کے مختلف شعبوں کے ذمے داروں کی کارکردگی کا مرقع اور سماجی استحصال کا آئینہ ہے۔

□□□

محمد خلیل

روبوٹ — مشینی انسان

تھامس نامی ایک نوجوان 1246 میں اپنے استاد البرٹ کے گھر گیا۔ وہاں دروازے پر لٹکے لوہے کے ہتھوڑے کو اس نے اٹھایا اور اس سے دروازے پر تین مرتبہ دستک دی۔ دروازے کے پیچھے کی طرف کسی کے چلنے کی آہٹ سنائی دی۔ اسے کچھ حیرانی سی ہوئی۔ پرانی نوکرانی مارتھا کے چلنے کی آواز ایسی نہ تھی۔ کیا اس کے استاد نے کوئی نئی نوکرانی رکھ لی ہے۔ وہ ابھی سوچ بھی نہ پایا تھا کہ دروازہ کھلا۔

تھامس نے اس انجانی عورت کو سلام کیا اور اندر داخل ہوگیا۔ عورت نے عجب سی آواز میں سلام کا جواب دیا۔ عورت کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا اور آواز بناوٹی سی معلوم ہورہی تھی۔ اندر آکر وہ عورت ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور خود کو پنکھا جھلنے لگی۔ پھر اچانک رک کر بولی ''تمھارا استاد لائبریری میں تمھارا انتظار کررہا ہے۔'' تھامس نے دیکھا کہ اس کے ہونٹوں کے ہلنے اور لفظوں کے کہنے میں کوئی میل نہیں تھا۔ آواز منہ کی جگہ اس کے سینے سے آتی ہوئی لگ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ نہیں کوئی اور بول رہا ہے۔ تھامس نے اسے کوئی بھوت پریت سمجھا اور پاس میں رکھی ہوئی ایک چھڑی سے اس عورت کی پٹائی شروع کردی۔ مار پیٹ کی آواز سن کر بزرگ استاد بھاگا ہوا کمرے میں آیا لیکن اس وقت تک وہ عورت خاموش اور بے جان ہوچکی تھی۔ اس کے جسم کے مشینی ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے ہوئے پڑے تھے۔

تھامس کا استاد البرٹ چلایا ''او بے وقوف! تم نے میری تین سال کی محنت برباد کردی۔

اصل میں وہ انسان کے ذریعے بنایا ہوا پہلا روبوٹ تھا۔ اب نہ تو البرٹ کی اس عورت کا کوئی نشان ہی باقی ہے اور نہ ہی اس کے بنائے جانے کے بارے میں کوئی جانکاری ہے۔ اس واقعے کا ذکر کتابوں میں رہ گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ انسان کی عقل اور طاقت کی کوئی آخری حد نہیں ہے۔ انسان مدتوں سے نئی نئی ایجادیں کرتا رہا ہے اور اس کی یہ لگن آج بھی برقرار ہے۔ گذشتہ پچاس برسوں میں کمپیوٹر نے کتنی ترقی کی ہے۔ کمپیوٹر اور دوسرے تکنیکی طریقوں کی مدد سے روبوٹ بنائے گئے ہیں آج تقریباً لاکھوں کی تعداد میں روبوٹ دنیا کے مختلف ملکوں میں مثلاً امریکہ، برطانیہ، جرمنی، جاپان وغیرہ میں موجود ہیں۔ زیادہ درجۂ حرارت پر گاڑیوں پر روغن کرنا، کٹائی کرنا، پالش کرنا، سامان اتارنا چڑھانا، آگ بجھانا، عمارتوں میں اونچائی تک پہنچ کر کام کو انجام دینا، آپریشن کرنا، گھر کی حفاظت کرنا اور اطلاع دینے کے کئی طرح کے کام روبوٹ انجام دے

رہا ہے۔

لیکن ابھی جو روبوٹ جس خاص کام کے لیے بنایا جاتا ہے وہ وہی کام کر پاتا ہے۔ اس طرح کے روبوٹ صرف حکم پر عمل کرتے ہیں۔ وہ گونگے، بہرے اور اندھے ہوتے ہوئے تکنیک کی مدد سے کام کر رہے ہیں۔ لیکن کسی چیز کو اٹھاتے وقت ان کے ہاتھ سے اگر وہ چیز گر جائے تو وہ پھر اسے اٹھا نہیں سکتے۔ اب ایسے روبوٹ بن گئے ہیں جو حالات کے مطابق فیصلہ لینے کی طاقت رکھتے ہیں۔ لینن گراڈ کے ایک سائنسی ادارے نے ایسا روبوٹ تیار کیا ہے جو اپنے خاص طرح کے مصنوعی مشینی ہاتھ کے ذریعے لوہے کو بھٹی میں ڈال کر ایک خاص درجۂ حرارت تک گرم ہونے پر اسے باہر نکال کر خود تیل میں ڈبو دیتا ہے اور ضرورت کے مطابق اسے موڑ دیتا ہے۔ ہنگری کے سائنسدانوں نے ایک ایسا روبوٹ تیار کیا ہے جو الگ الگ چیزوں کو اٹھا کر طے کی ہوئی مختلف جگہوں پر رکھ سکتا ہے۔ یہ ایسا روبوٹ ہے جو تقریباً چار ہزار سے زیادہ چیزں کو پہنچاننے کی طاقت رکھتا ہے۔ اسی طرح جاپان کا ایک روبوٹ نو رنگوں کو پہچان سکتا ہے اور اپنا کام پورا کرنے کے بعد اس میں بھول اور غلطیوں کو خود صحیح کر لیتا ہے۔ نیز جیسے ہی کام کو پورا کر لیتا ہے اس کی اطلاع دیتا ہے۔ یہ روبوٹ کئی قسم کی مشینوں پر کام کرنے میں کامیاب ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جب اس روبوٹ کو اس کی طاقت سے زیادہ کا کام دیا جاتا ہے تو یہ اس کام کو کرنے سے اشارے میں یا آواز سے منع کر دیتا ہے۔ جاپان میں اس طرح کے روبوٹ بھی تیار کیے گئے ہیں جو پیغام لے کر کسی جگہ پر جا سکتے ہیں وہ خود ہی چل کر لفٹ کا بٹن دبانے کی تکنیک سے لیس ہیں۔ پیغام دینے کے بعد وہ اپنی جگہ پر واپس آجاتے ہیں۔

سب سے زیادہ حیران کرنے والا روبوٹ ایڈن برگ کے سائنسدانوں نے بنایا ہے۔ اس کی شکل خوفناک دیو جیسی ہے۔ اس کی دو بڑی بڑی زبانیں اور دو بڑی بڑی آنکھیں ہیں۔ اس روبوٹ کی شکل انسان سے ملتی جلتی بنائی گئی ہے۔ یہ روبوٹ تقریباً چھ اسکوائر میٹر جگہ گھیرتا ہے اور اپنے چاروں طرف بکھرے پُرزوں کو جوڑ کر پوری بس بنا دیتا ہے۔

سائنسدانوں کا خیال ہے کہ آئندہ آنے والے برسوں میں ایسے روبوٹ بن جائیں گے جو خود دیکھ اور سن سکیں گے۔ ان میں وزن کو ناپنے اور اندازہ کرنے کی طاقت ہوگی۔ روبوٹ آئندہ باورچی خانے میں بھی مددگار ثابت ہوگا مثلاً کھانا پکانا اور گندے برتن دھونا۔ یہ بستر لگانے، کپڑے سکھانے، استری کرنے اور سبزیاں وغیرہ چھیلنے میں بھی مدد کر سکے گا۔

روبوٹ کی قسمیں برابر بڑھ رہی ہیں جس سے انسانی زندگی میں بہت سی سہولتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ لیکن یہ سہولتیں آگے چل کر آدمی کو ضرورت سے زیادہ آرام پسند اور کاہل نہ بنا دیں اور اس کی قوتِ عمل نہ سلب کر لیں اس پر بھی سوچنے کی ضرورت ہے۔

□□□

H51 DR Iqbal Lane, Batla House, Jamia Nagar, New Delhi-110025

نور پیکر

ملاّ نصرالدین کا جبہ

شہر بغداد میں ایک درزی رہا کرتا تھا۔ وہ اپنے فن میں بہت ماہر تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کسی کا ناپ نہیں لیتا تھا۔ جب کوئی کپڑا سلوانے کے لیے آتا تو وہ اس شخص کا ایک بار جائزہ لے لیتا تھا۔ اس کے بعد وہ کپڑا سی کر اسے دے دیتا تھا۔ کیا مجال کہ وہ کپڑا چھوٹا یا بڑا، ڈھیلا یا تنگ ہو جائے۔ اسی خوبی کی وجہ سے وہ پورے شہر بغداد میں مشہور تھا۔ وہ درزی جہاں بہت ساری خوبیوں کا مالک تھا وہیں اس میں کچھ عیب بھی تھے۔ ایک عیب یہ تھا کہ وہ بہت چرب زبان تھا۔ جھوٹ بولنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اس میں ایک عیب یہ بھی تھا کہ وہ کپڑا ضرور چرایا کرتا تھا۔

اس کی دکان میں چاہے امیر آئے یا غریب وزیر یا فقیر وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق تھوڑا بہت کپڑا ضرور چرالیا کرتا تھا۔ اور اپنی چرب زبانی سے ثابت کر دیتا تھا کہ کپڑا کم تھا۔ مجبوراً آدمی تھوڑا اور کپڑا خرید کر لاتا اور اس کے حوالے کر دیتا تھا۔ ان تمام باتوں کو جانتے ہوئے بھی لوگ اسی درزی سے کپڑا سلوانا چاہتے تھے۔

ایک بار ملاّ نصرالدین اسی درزی کے یہاں اپنا جبہ سلوانے کے لیے گئے۔ درزی پر رعب ڈالنے کے لیے ملاّ نے کہا: ''میاں درزی! چوری کرنا بری بات ہے، قیامت کے دن تیرے چرائے ہوئے کپڑوں کا جھنڈا بنا کر اس کے نیچے تجھے کھڑا کیا جائے گا، اس سے میدانِ حشر میں تیری بہت رسوائی اور بدنامی ہوگی۔'' درزی یہ سن کر سہم گیا۔ اس نے ملاّ نصرالدین کے سامنے توبہ کی اور آئندہ کپڑا چوری نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ ملاّ نصرالدین نے جب دیکھا کہ درزی بہت خوف زدہ ہے۔ تو انھوں نے کہا'' جب جبہ بن جائے تو اس کے بچے ہوئے کپڑے سے ایک ٹوپی ضرور بنا دینا اور اگر کچھ اور بچ رہے تو ایک رومال بھی۔'' درزی نے حامی بھر لی۔ ملاّ نصرالدین خوشی خوشی گھر واپس آگئے۔

درزی کے دیے ہوئے وقت پر ملاّ نصرالدین جب اس کی دکان پر گئے تو دیکھا کہ دکان کھلی ہوئی ہے لیکن درزی غائب ہے۔ وہ دکان کے اندر بیٹھ گئے۔ بہت دیر تک انتظار کرتے کرتے جب اکتا گئے تو دکان میں رکھی ہوئی چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ انھوں نے دیکھا کہ ان کا جبہ تیار ہو گیا ہے اور قرینے سے رکھا ہوا ہے۔ اچانک ان کی نظر ایک کونے میں پڑی ان کے جبے والے کپڑے کا ایک بڑا سا ٹکڑا دوسرے کپڑوں کے اندر سے جھانک رہا تھا۔ ملاّ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے اس ٹکڑے کو اپنی جیب میں چھپا لیا۔ وہ سمجھ گئے کہ اپنی عادت سے مجبور درزی نے کپڑا چرا لیا ہے۔

کچھ ہی دیر کے بعد درزی آ گیا اور آتے ہی ان کا جبہ ان کے حوالے کر دیا۔ ملاّ نصرالدین نے اپنا پرانا جبہ اتارا اور نیا جبہ پہن لیا۔ لیکن یہ کیا؟ اس میں تو ایک آستین ہی نہیں ہے؟ نصرالدین نے حیرت سے کہا۔

درزی نے بڑی معصومیت سے جواب دیا: ''حضور! آپ کی آستین اچانک کہیں غائب ہو گئی میں نے آپ کی ٹوپی کو اس کی تلاش میں بھیج دیا ہے۔ ٹوپی کے آستین کو پکڑ کر لاتے ہی میں آستین بھی لگا دوں گا اور ٹوپی بھی دے دوں گا۔'' ملاّ نصرالدین نے اپنی جیب سے آستین کا کپڑا نکال کر درزی کو دیتے ہوئے کہا: ''مجھے ایک گدھے کی شادی میں شرکت کرنی ہے جلدی سے آستین لگا دو۔''

درزی نے ناچار جلدی جلدی آستین بنا کر جبہ ملاّ نصرالدین کے حوالے کیا۔ جب نصرالدین جانے لگے تو درزی نے کہا:

''جناب! اجرت تو دیتے جائیے۔''

ملاّ نصرالدین نے پلٹ کر برجستہ جواب دیا: ''محترم میری ٹوپی کو تو آنے دیجیے!'' درزی ان کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

□□□

89 Kavez Ghat Road, Shebpur, Horah-2

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

قطب مشتری

مصنف:
پروفیسر سید عابد حسین
صفحات:236
قیمت:-/48روپے

سخنورانِ گجرات

مصنف:
سید ظہیرالدین مدنی
صفحات:344
قیمت:-/77 روپے

قدیم ہندی فلسفہ

مرتبہ:
رائے شیو موہن لعل ماتھر
صفحات:376
قیمت:-/82 روپے

دکنی نثر کا انتخاب
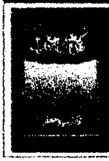

مرتب:
پروفیسر نصیر الدین ہاشمی
صفحات:172
قیمت:-/45روپے

دکن میں مرثیہ اور عزاداری

مصنف:
ڈاکٹر رشید موسوی
صفحات:316
قیمت:-/17 روپے

کپل کا فلسفہ سانکھیہ

مرتبہ:
کرشن کمار پاٹھک
صفحات:208
قیمت:-/30 روپے

اردو املا

مصنف:
رشید حسن خاں
صفحات:706
قیمت:-/125 روپے

دکنی ہندو اور اردو

مصنف:
پروفیسر نصیر الدین ہاشمی
صفحات:296
قیمت-/111 روپے

ہندی فلسفہ کے عام اصول

مرتبہ:
شیو موہن لعل ماتھر
صفحات:320
قیمت-/18 روپے

شریمد بھگوت گیتا

مصنف:
حسن الدین احمد
صفحات:120
قیمت-/38 روپے

سوٗرداس کے روحانی نغمے
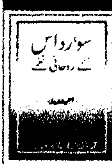

مصنف:
جعفر رضا زیدی
صفحات:263
قیمت-/91 روپے

تاریخ ہندی فلسفہ جلد اوّل
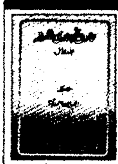

مصنف:
ایس این داس گپتا
صفحات:574
قیمت-/89 روپے

اردو کی کہانی
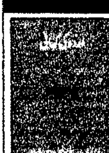

مصنف:
سیّد احتشام حسین
صفحات:104
قیمت-/32 روپے

تذکرہ گلشن ہند
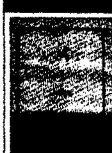

مصنف:
میرزا علی لطف
صفحات:208
قیمت-/90 روپے

دل کی گیتا

مصنف:
مخمور سعیدی
صفحات:240
قیمت-/92 روپے

RNI No. 70323/99
DL-SW-15/4104/2009-11
Date of Publication : 24/09/2009
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, October 2009, Vol. 11, Issue: 10
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

''فکر و تحقیق''

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نامعلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے

اکتسابات سے مستقبل کو مالا مال بنانے کی ایک تحریک

خود بھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت : 100 روپے، فی شمارہ 25 روپے

زر سالانہ بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

دہلی سے باہر کے خریدار صرف ڈرافٹ یا منی آرڈر ہی ارسال کریں۔

بیرونی خریداروں کے لیے

Printed and Published by Dr. M. Hamidullah Bhat, Director, NCPUL on behalf of NCPUL West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 70 GSM Paper produced by TNPL Editor: Dr. M. Hamidullah Bhat, Tel: 26103381, 26103938